Phone: 7500

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

اپریل 1961ء

مولانا ابوالکلام آزاد

اپنی تفسیر (ترجمان القرآن) جلد اول (شائع کردہ زمزم کمپنی) کے صفحہ ۱۰۹ پر، خدا کی رحمت و آمرزش کے سلسلہ میں، صحیح مسلم کی یہ حدیث نقل فرماتے ہیں۔

والذی نفسی بیدہ ۔ لولم تذنبوا لذھب اللہ بکم و لجاء بقوم یذنبون فیستغفرون ۔ (مسلم عن ابی ہریرہ)

اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اگر تم ایسے ہو جاؤ کہ گناہ تم سے سرزد ہی نہ ہو، تو خدا تمہیں زمین سے ہٹا دے اور تمہاری جگہ ایک دوسرا گروہ پیدا کر دے جس کا شیوہ یہ ہو کہ گناہوں میں مبتلا ہو اور پھر خدا سے بخشش و مغفرت کی طلبگاری کرے۔

فدائے شیوۂ رحمت کہ در لباسِ بہار بعذر خواہیٔ رندان باد نوش آمد

شائع کردہ:

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور

قیمت ۷۵ پیسے

قرآنی نظامِ ربوبیت پر ماہنامہ

طلوعِ اسلام لاہور

بدل اشتراک
ہندو پاکستان سے سالانہ ۔ آٹھ روپے
غیر ممالک سے سالانہ ۔ ۱۲ شلنگ

قیمت فی پرچہ
ہندو پاکستان سے
۷۵ نئے پیسے

ٹیلیفون نمبر ۷۵۰۰
خط و کتابت کا پتہ
ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۔ ۲۵ ۔ بی ۔ گلبرگ لاہور

جلد ۱۴ | اپریل ۱۹۶۱ء | نمبر ۴

فہرست مضامین

لمعات		۲
رسالت کی آئینی حیثیت	(مکرم ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب)	۹
ایک سلیم بیٹے کا خط		۵۳
تیسری طاہرہ بیٹی کا خط		۵۷
باب المراسلات		۶۵
رابطۂ باہمی		۷۳

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

قرآن کریم میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ (بہترین ہیئت پر) پیدا کیا۔ لیکن اس کی حالت یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو پست ترین سطح تک لے جاتا ہے۔ ایسی پست سطح تک کہ یہ حیوانات سے بھی نیچے گر جاتا ہے اور شَرَّ الدَّوَآبِّ (بدترین مخلوق) بن جاتا ہے۔ یوں تو قرآن کریم کی بیان کردہ حقیقت کا مشاہدہ حیاتِ انسانی کے ہر شعبہ میں کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کی زندگی کا ایک گوشہ ایسا ہے جہاں یہ حقیقت اُبھر کر سامنے آجاتی ہے۔ اور یہ گوشہ ہے انسان کی عائلی (گھر کی) زندگی کا۔ دنیا میں کسی حیوان نے اپنے جوڑے کے ساتھ وہ کچھ نہیں کیا جو مرد نے عورت کے ساتھ کیا ہے۔ تقسیم کار کی رُو سے فطرت نے عورت کے سپرد ایک بلند اور مقدس فریضہ کیا تھا ـــــــ یعنی نسلِ انسانی کی پرورش اور بچوں کی تربیت سے قوموں کی تشکیل کا فریضہ ـــــــ ظاہر ہے کہ اس عظیم ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لئے عورت کو اپنی زندگی اور توانائی کا بیشتر حصہ اس کے لئے وقف کر دینا پڑتا ہے اور یوں وہ اکتسابِ رزق کے لئے وقت نہیں نکال سکتی - یہ فریضہ مرد کے سپرد کیا گیا تھا۔ لیکن مرد نے اس صورتِ حالات کا ناجائز فائدہ اٹھایا اور عورت کی "معاشی احتیاج" کی آڑ میں اس پر وہ مظالم روا رکھے جن کے تصور سے رُوح کانپ اُٹھتی ہے۔ قرآن کریم نے آکر جہاں انسان کو ہر قسم کی غلامی کی لعنت سے نجات دلائی، وہاں اُس نے عورت کو مرد کے پنجۂ استبداد سے بھی چھڑایا اور مصافِ زندگی میں مرد کے دوش بدوش چلا کر اُسے شرفِ انسانیت اور تکریمِ آدمیت سے سرفراز کر دیا۔ لیکن تھوڑے عرصہ بعد اُمت کی گاڑی پھر دوسری پٹڑی پر پڑ گئی اور قرآنی قوانین کی جگہ آہستہ آہستہ انسانوں کے خود ساختہ قوانین لیتے چلے گئے۔ اس سلسلہ میں جو قوانین عورتوں کے متعلق وضع کئے گئے اُن سے صاف نظر آتا ہے کہ وہ جو کچھ عرصہ کے لئے عورت (بیچاری) کو قرآنی آزادی مل گئی تھی، مرد نے اُس کا سخت انتقام لیا اور اب کے اس کی مشکیں ایسی کس کر باندھیں کہ یہ ہل تک نہ سکے۔

طلوعِ اسلام کے نزدیک، پاکستان کا قیام اس لئے عمل میں آیا تھا کہ یہاں قرآنی نظامِ مملکت کی تشکیل اور قوانینِ خداوندی کی تنفیذ ہو۔ قیامِ پاکستان کے بعد طلوعِ اسلام نے اس مقصدِ جلیلہ کے حصول کے لئے امکان بھر کوشش شروع کی اور اس کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ ظاہر ہے کہ عورتوں کے متعلق قرآنی قوانین کا احیاء اور نفاذ بھی اس کے دائرۂ سعی و عمل میں شامل تھا اس ضمن میں اس نے جو کچھ کیا اس کے دُہرانے کی ضرورت نہیں، قارئین اس سے بخوبی واقف ہیں۔ سنہ ۱۹۵۵ء میں حکومت کی طرف سے ایک کمیشن مقرر ہوا کہ وہ مروجہ عائلی قوانین کی چھان بین کرے اور انہیں قرآنِ کریم کے مطابق مرتب کرنے کی سفارشات پیش کرے اس کمیشن کی طرف سے شائع کردہ سوالنامہ کا تفصیلی جواب طلوعِ اسلام کی اشاعت بابت مارچ سنہ ۱۹۵۶ء میں قارئین کی نظروں سے گزر چکا ہے۔ ان جوابات (نیز محترم پرویز صاحب کی کتاب "طاہرہ کے نام خطوط") سے یہ حقیقت واضح طور پر سامنے آجاتی ہے کہ ہمارے مروجہ قوانین جو ہمارے دورِ ملوکیت میں وضع ہوئے اور جنہیں بدقسمتی سے "قوانینِ شریعت" کا نام دیدیا گیا، کس طرح قرآن کی نقیض ہیں۔ جون سنہ ۱۹۵۶ء میں کمیشن نے اپنی رپورٹ پیش کی۔ ہم نے اگست سنہ ۱۹۵۶ء کے طلوعِ اسلام (لمعات) میں کمیشن کی سفارشات کا جائزہ لیکر بتایا کہ ان میں سے کون کون سی قرآنِ کریم کے احکام یا منشاء کے مطابق ہیں۔ کون کون سی ایسی ہیں جن کے متعلق کمیشن نے مروجہ قوانین اور قرآنی احکام کے بین بین کا مسلک اختیار کیا ہے۔ اور کن مقامات پر انھوں نے قرآن کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا ہے۔ جہاں تک ان سفارشات کا تعلق تھا جو قرآن کے مطابق تھیں ہم نے اپنے جائزہ کے اخیر پر لکھا تھا کہ:-

> "ہم حکومت سے استدعا کریں گے کہ وہ کمیشن کی سفارشات کے معاملہ میں اپنے روایتی تساہل کو چھوڑ کر بہت جلد عملی قدم اٹھائے، کیونکہ اس باب میں جتنی تاخیر ہوگی مُلک میں انتشار پیدا کرنے والے عناصر کو شرانگیزیوں کے لئے اتنا ہی زیادہ موقعہ مل جائے گا۔"

یہ حقیقت ہے کہ ان سفارشات میں بعض ایسی تھیں جو مروجہ قوانین کو قرآنی قوانین سے بدل دینے کے حق میں تھیں ہمارے قدامت پرست طبقہ کو نعل برآتش کر دینے کے لئے کافی تھی۔ کیونکہ اس سے ان کے وہ اختیارات چھن جاتے تھے جو پرسنل لاز (شخصی قوانین) کے اجارہ دار ہونے کی حیثیت سے انہیں حاصل ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ کمیشن نے اپنی رپورٹ میں اس قسم کے ریمارکس بھی دیدیئے تھے۔ مثلاً:-

> "جس طرح اسلام کسی ایسے بادشاہ کے وجود کو تسلیم نہیں کرتا جو غلطیوں سے معصوم اور قانون کی حد سے بالا ہو۔ اسی طرح وہ مذہبی پیشواؤں کے وجود کو بھی تسلیم نہیں کرتا۔ اس میں شبہ نہیں کہ بعض افراد کو اسلامی قوانین کا علم دوسروں کی بہ نسبت زیادہ ہوگا، لیکن اس سے ان کا کوئی الگ گروہ نہیں بن جاتا۔ نہ ہی انہیں کوئی خاص اختیارات حاصل ہو جاتے ہیں یا خاص مراعات مل سکتی ہیں۔ .... قانون کا تعلق انجامِ کارِ زندگی کے تجارب سے ہے جس پر صرف اربابِ مذہب کی اجارہ داری نہیں۔"

مذہبی پیشوائیت کی طرف سے اس کا ردِ عمل بالکل واضح ہے۔ چنانچہ انھوں نے ان سفارشات کی مخالفت کی جس کا نتیجہ

یہ ہوا کہ ان پر عملدرآمد کا مسئلہ کھٹائی میں پڑ گیا۔

۳۔ مارچ ۱۹۶۱ء کا دن پاکستان کی تاریخ میں ہی نہیں بلکہ خود اسلام کی تاریخ میں سورج کی کرنوں سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ اس دن صدرِ مملکتِ پاکستان نے کمیشن کی بعض سفارشات کو بحیثیتِ قانون نفاذ پذیر ہونے کا آرڈیننس جاری فرمایا۔ یہ چیز بجائے خود بڑی اہم ہے لیکن جس حقیقت کے پیشِ نظر ہم نے اس دن کو اسلام کی تاریخ میں قابلِ یادگار قرار دیا ہے وہ اس سے زیادہ عمیق ہے۔ اس آرڈیننس کو شائع کرتے وقت محترم وزیرِ قانون (مملکتِ پاکستان) نے ان قوانین کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے ایک پریس کانفرنس میں کہا کہ:۔

"اس آرڈیننس کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ پاکستان کی مسلم خواتین کو وہ حقوق دیئے جائیں جو انھیں قرآن کریم نے عطا کئے ہیں۔"

تعددِ ازدواج کی شق کو پیش کرتے ہوئے انھوں نے کہا:۔

"اس شق سے مقصد یہ ہے کہ قرآنِ کریم نے تعددِ ازدواج کے سلسلہ میں جو شرائط عائد کی ہیں، انھیں پورا کیا جائے۔"

طلاق سے پہلے مصالحتی اقدامات کے سلسلہ میں انھوں نے کہا کہ:۔

"جب تک ایسا نہ کیا جائے گا قرآنِ کریم نے میاں بیوی کی مصالحت کے لئے جو تاکید کی ہے، اُس پر عملدرآمد نہیں ہو سکے گا۔"

آپ نے غور فرمایا کہ اس بیان میں خصوصیت سے کیا کہا گیا ہے؟ کہا یہ گیا ہے کہ مملکتِ پاکستان مسلم عورتوں کو وہ حقوق دینا چاہتی ہے جو انھیں قرآنِ کریم نے عطا فرمائے ہیں۔ حکومت مرد اور عورت کی آزادی اور پابندی کے لئے وہی حدود و شرائط مقرر کرنا چاہتی ہے جو قرآنِ کریم نے متعین کی ہیں۔ ایک مملکت کی طرف سے یہ اعلان کہ وہ قرآنی قوانین نافذ کرنا چاہتی ہے، اتنا عظیم انقلاب ہے جس کا صحیح صحیح اندازہ آنے والا مورخ ہی لگا سکے گا۔ گوشِ زمانہ صدیوں سے اس نویدِ جاں نواز و نشیدِ انسانیت ساز کے لئے ترس رہا تھا۔ کس قدر مبارک و مسعود ہے وہ ساعت جس میں یہ صدائے ربانی پھر سے فردوسِ گوش بنی۔ اور کیسی مایہ ناز ہے وہ سرزمین جسے اس کے ماذن بننے کی سعادت نصیب ہوئی۔

یہ ہے وہ "عمیق حقیقت" جس کی بناء پر ہم نے کہا ہے کہ اسلام کی تاریخ میں اس دن کی یاد ہمیشہ قائم رہیگی۔ ہم مملکتِ پاکستان کے سربراہ، فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں، اور ان کے رفقائے کار کو مستحقِ ہزار تبریک و تہنیت سمجھتے ہیں کہ اسقدر بلند سعادت ان کے حصے میں آئی۔ وہ اپنے نصیبہ کی اس یاوری پر جس قدر بھی فخر کریں کم ہے۔

اس اصول کا اعلان کہ ہمارے قوانین کی بنیاد قرآنِ کریم پر ہونی چاہیئے، ایسا مسرت بخش و کیف آور ہے کہ جس شخص کے دل میں ذرا سی بھی ایمان کی رمق ہو وہ اس پر جھوم اُٹھے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، اور ملک کے بیشتر حصے میں اس اعلان پر

غلغلہ ہائے تبریک و تہنیت بلند ہوئے، لیکن، جہاں یہ امر موجبِ صد فخر و انبساط ہے، وہاں یہ حقیقت باعثِ ہزار تأسف و ندامت ہے کہ خود مسلمانوں ہی کے ایک طبقے کی طرف سے اس کی مخالفت ہوئی ——— اور ستم بالائے ستم کہ یہ طبقہ وہ ہے جو مذہبی امامت و پیشوائیت کا مدعی ہے۔ یا للعجب!

اے محمدؐ اگر قیامت را برآری سر ز خاک
سر برآرد ایں قیامت درمیانِ خلق بیں!

ہو سکتا ہے کہ اس اصول کی جزئیات میں کوئی اختلاف ہو، یا ان قوانین کی تعبیرات سے آپ بالکلیہ متفق نہ ہوں یا انہیں بروئے کار لانے کے طریق کو قابلِ اصلاح خیال کرتے ہوں لیکن اس اصول کے اعلان پر صفِ ماتم بچھ جانا ایک ایسا دردانگیز سانحہ ہے جس پر ہر چشمِ حساس خون کے آنسو روئے گی۔

اس طبقہ کی طرف سے اس انقلاب آفرین اصول کی مخالفت بے قابلِ فہم۔ جب خلافت، ملوکیت میں تبدیل ہوئی تو اس کا لازمی نتیجہ دین و دنیا اور مذہب و سیاست کی ثنویت تھی۔ اس ثنویت کی رُو سے ملکی قوانین حکومت کی تحویل میں رہے۔ اور شخصی قوانین اس مذہبی پیشوائیت کے سپرد کر دیئے گئے جسے مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا۔ اس طرح مسلمانوں میں دو متوازی حکومتیں قائم ہو گئیں۔ جنکا سلسلہ اب تک جاری ہے۔ ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کے خاتمہ کے بعد انگریز نے بھی اس تقسیمِ اختیارات کو برقرار رکھا۔ جب ہندوستان میں، تحریکِ پاکستان کی آواز بلند ہوئی تو ہمارے علمائے کرام نے (بجز مستثنیات) اس تحریک کی سخت مخالفت کی۔ وہ اس کے مقابلہ میں متحدہ ہندوستان میں سیکولر حکومت کو ترجیح دیتے تھے۔ اس کی وجہ ظاہر تھی۔ سیکولر حکومت میں شخصی قوانین مذہبی پیشوائیت کے ہاتھ میں رہتے ہیں۔ اس کے برعکس تحریکِ پاکستان کی بنیاد ہی اس دعوے پر تھی کہ ہمیں ایک ایسا خطۂ زمین مطلوب ہے جس میں ہم صحیح اسلامی حکومت قائم کر سکیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ صحیح اسلامی حکومت میں پبلک لاز (مدنی قوانین) اور پرسنل لاز (شخصی قوانین) کی تمیز باقی نہیں رہتی۔ تمام قوانین مملکت کی تحویل میں چلے جاتے ہیں، اور نہ صرف مذہبی پیشوائیت کا اقتدار ختم ہو جاتا ہے، بلکہ اس کا وجود ہی باقی نہیں رہتا۔ یہ تھی ان حضرات کی طرف سے تحریکِ پاکستان کی مخالفت کی بنیادی وجہ۔ لیکن پاکستان ان کی مخالفت کے علی الرغم وجود میں آگیا۔ یہاں پہنچ کر انھوں نے پینترا بدلا اور دس سال تک مسلسل و متواتر اس کوشش میں رہے کہ یہاں اس انداز کا آئین نافذ ہو جائے جس میں اقتدار کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں رہے۔ ۱۹۵۸ء کے عسکری انقلاب نے ان کے اس خواب کو خوابِ پریشاں بنا دیا۔ اور اب حکومت کی طرف سے اس اعلان نے ان کی رہی سہی امیدوں کا بھی خاتمہ کر دیا۔ اب آپ سوچئے کہ جن کے ہاتھوں سے اتنی بڑی متوازی حکومت چھن رہی ہو، وہ صفِ ماتم نہ بچھائیں تو کیا جشنِ مسرت منائیں؟ ان قوانین سے سب سے بڑی (اور براہِ راست) زک احتشام الحق صاحب کو پہنچی ہے۔ انھوں نے کمیشن کے رکن کی حیثیت سے، کمیشن کی سفارشات کے خلاف اختلافی نوٹ لکھا تھا۔ اس آرڈیننس سے ان کے اعصاب پر کیا اثر ہوا ہے اس کا اندازہ اس قبص بل سے لگ سکتا ہے جب انھوں نے رویتِ ہلالِ عید

کے مقدس نقاب میں چھپانے کی ناکام کوشش کی ہے۔ یہ حقیقت کہ ان قوانین کی مخالفت کی حقیقی وجہ یہ نہیں کہ یہ (ان حضرات کے خیال کے مطابق) شریعت کے خلاف ہیں، بلکہ وجہ یہ ہے کہ اس سے ان کے اقتدار پر زد پڑتی ہے، اس سے بھی ظاہر ہے کہ اس وقت ملک میں کئی ایک (مدنی) قوانین ایسے رائج چلے آ رہے ہیں جو (قرآن ہی کے نہیں بلکہ خود) ان حضرات کی شریعت کے بھی خلاف ہیں۔ مثلاً زنا سے متعلق قوانین ــــــ ان کے خلاف ان حضرات کی حمیتِ دینی میں جوش آنا تو ایک طرف، اس میں کبھی ہلکا سا ارتعاش بھی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ اس لئے کہ اس سے ان کے اقتدار پر زد نہیں پڑتی۔ اس کے برعکس (مثلاً) رویتِ ہلال جیسے مسئلہ کو (کہ جس کا شریعت سے دُور کا بھی واسطہ نہیں) اتنی اہمیت دی جاتی ہے کہ احتشام الحق صاحب حکومت کو چیلنج دیدیتے ہیں کہ وہ اس میں سرکاری حکام کی دخل اندازی کو بھی گوارا نہیں کر سکتے، اور اس حق کے تحفظ کے لئے اپنے خون کا آخری قطرہ بہا دینے کو تیار ہیں (بحوالہ پاکستان ٹائمز مورخہ ۲۰ مارچ ۱۹۶۱ء)۔ یہ کیا ہے؟ وہی اپنے اقتدار کے تحفظ کا جذبہ جس کے متعلق سعدی نے کہا تھا کہ "دو شاہنشاہ با قلیمے نگنجند"۔ مذہبی پیشوائیت اپنی "مملکت" میں دوسری مملکت (حکومت) کے نمائندگان کو کس طرح دخل انداز ہونے دے سکتی ہے۔ یہی جذبہ عائلی قوانین کی مخالفت کے پیچھے کارفرما ہے۔

اس سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ اس وقت بات "عائلی قوانین" کی نہیں۔ اصل سوال یہ ہے کہ یہ جو (مملکت اور مذہبی پیشوائیت کی) دو متوازی حکومتیں چلی آ رہی ہیں۔ انھیں ختم کر کے دین کو اس کے اصلی مقام پر لایا جائے۔ یا انہیں بدستور برقرار رکھ کر ملت کی دنیا و دین دونوں کو تباہ ہونے دیا جائے! یہ سوال جس کی ابتدا پاکستان سے ہوتی ہے مسلمانوں کے تمام ممالک میں زود یا بدیر سامنے آنے والا ہے اور اس کے جواب پر ملتِ اسلامیہ کے مستقبل کا انحصار ہے۔ زمانہ اس انتظار میں ہے کہ دیکھئے کہ اس اُمت کا راہ گم کردہ کارواں اس دوراہے پر کونسا راستہ اختیار کرتا ہے۔

اب زیرِ نظر آرڈیننس کی مختلف دفعات کو لیجئے۔ اس میں سب سے پہلی دفعہ کا ملخص یہ ہے کہ یتیم پوتے اور پوتیاں اور نواسے اور نواسیاں اپنے دادا اور نانا کے ترکہ سے وہ حصہ پائیں گے جو اُن کے والد یا والدہ کو ملنا تھا۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ ان محروم الارث، مظلوم یتیموں کو اُن کا جائز قرآنی حق دلانے کے لئے طلوعِ اسلام نے گزشتہ تیرہ سال میں کیا کچھ کیا ہے۔ بحمداللہ کہ بالآخر حق کو کامیابی ہوئی اور ان مظلوموں کو اُن کا حق مل گیا۔ اس وقت (جبکہ ہم یہ سطور سپردِ قلم کر رہے ہیں) ہمارے سامنے وہ سینکڑوں خانماں برباد گھرانے ہیں جن کے ناکردہ گناہ مظلوم یتیم بچے ہمارے پاس آتے رہے، یا اپنی غم آلود جگر پاش داستانیں ہم تک پہنچاتے رہے۔ اس تصور سے کہ ان گھرانوں کو اس داد رسی سے کس قدر خوشی ہوئی ہوگی، ہماری آنکھوں میں مسرت کے آنسو چھلک آئے ہیں۔ اور ہمارا سرِ نیاز بدرگاہِ ربّ العزت سجدۂ تشکرانہ کے لئے جھک رہا ہے۔ یہ فیصلہ کس طرح عین قرآن کریم کے مطابق ہے، اس کے متعلق تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ ہم اس موضوع پر متعدد بار شرح و بسط سے لکھ چکے ہیں۔ "یتیم پوتے کی وراثت" کے عنوان سے ہمارا شائع کردہ پمفلٹ اس وقت بھی ہزاروں گھروں میں موجود ہوگا۔

دوسری وفد کی رُو سے ضروری قرار دیا گیا ہے کہ ہر نکاح کا اندراج حکومت کے رجسٹر میں ہوا کرے۔ اس سلسلہ میں ہم نے (سوالنامہ کے جواب میں) کہا تھا کہ نکاح کا معاہدہ تو فریقین کی رضامندی سے مکمل ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر اس معاہدہ کی رجسٹری ہو جائے تو اچھا ہے۔ اس سے مستقبل میں پیدا ہونے والی بہت سی پیچیدگیاں رفع ہو سکتی ہیں۔ ہم نے یہ بھی تجویز کیا تھا کہ نکاح نامہ کا فارم بھی حکومت کی طرف سے مرتب کر دیا جائے۔ آرڈیننس میں اس تجویز کو بھی تسلیم کر لیا گیا ہے۔

تعدد ازدواج کے متعلق جو کچھ آرڈیننس میں مذکور ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک بیوی کی موجودگی میں دوسری شادی کی اجازت اس صورت میں دی جائے گی جبکہ پہلی بیوی اس پر رضامند ہو اور ثالثی کونسل (جو فریقین کے نمائندگان پر مشتمل ہوگی) مطمئن ہو کہ دوسری شادی کے لئے معقول وجوہات موجود ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ یہ شرائط موجودہ صورتِ حالات کی بڑی حد تک اصلاح کر سکیں گی۔ لیکن یہ قرآنی منشا کو اب بھی پورا نہیں کرتیں۔ (جیسا کہ ہم متعدد بار تفصیل سے لکھ چکے ہیں) قرآن کریم میں تعدد ازدواج کے متعلق صرف ایک آیت ہے، اور وہ یوں ہے:۔ وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً ..... (۴/۳)۔ اس کا صاف ترجمہ یہ ہے کہ "اگر تمہیں ڈر ہو کہ تم "یتامیٰ" کے معاملہ میں انصاف نہیں کر سکو گے تو ان عورتوں میں سے اپنی حسب پسند دو دو تین تین۔ چار چار تک سے نکاح کر لو۔ پھر اگر تمہیں ڈر ہو کہ تم ان سے عدل نہیں کر سکو گے تو ایک ہی (پر اکتفا کرو)۔" اس میں ایک سے زیادہ بیوی کے لئے دو شرطیں عائد کی گئی ہیں۔

(۱)۔ اگر "یتامیٰ" کے مسئلہ کا کوئی اور منصفانہ حل نہ مل سکے۔ اور

(۲)۔ ایک سے زیادہ بیویوں میں باہمی عدل کر سکو۔

اگر یہ دونوں شرطیں پوری نہ ہوں تو ایک سے زیادہ بیویوں کی اجازت نہیں۔ نہ ہی قرآن نے کسی اور صورت میں دوسری شادی کی اجازت دی ہے۔

سوال یہ ہے کہ شرطِ اوّل سے مفہوم کیا ہے؟ "یتامیٰ" کے ساتھ انصاف کا مطلب کیا ہے؟ عربی زبان اور قرآن کریم (۴/۲) دونوں کی رُو سے یتامیٰ سے مراد صرف وہی بچے نہیں جن کے باپ مر چکے ہوں۔ ان میں وہ عورتیں (جوان نا تجربہ لڑکیاں یا بیوہ عورتیں) بھی شامل ہیں جو غیر شوہر کے ہوں۔ قرآن کہتا ہے کہ تمہارے لئے اصلاً اور بنیاداً تو ایک وقت میں ایک ہی بیوی کا قانون ہے (فَوَاحِدَةً) لیکن اگر معاشرہ میں ایسے حالات پیدا ہو جائیں (مثلاً جنگ کی وجہ سے) کہ مردوں کی کمی ہو جائے اور شادی کے قابل جوان لڑکیاں یا بیوہ عورتیں (اور ان کے یتیم بچے) اتنی تعداد میں بڑھ جائیں کہ ان کے مسئلہ کا منصفانہ حل نہ مل سکتا ہو تو ایسی ہنگامی حالت میں اسکی اجازت دی جاتی ہے کہ تم ان شادی کے قابل لڑکیوں یا بیوہ عورتوں میں سے حسب پسند ایک سے زیادہ سے شادی کر لو۔

یہ ہے پہلی شرط۔ اور دوسری شرط یہ ہے کہ تم بیویوں میں باہمی عدل کر سکو۔ آپ نے دیکھ لیا، قرآن کی رُو سے دوسری شادی کے لئے کسی شخص کی انفرادی ضرورت یا مصلحت کا سوال ہی نہیں۔ سوال صرف معاشرہ کی ہنگامی دشواری کے حل کا ہے۔ لہٰذا یہ

چیز معاشرہ کے طے کرنے کی ہوگی کہ ایسے حالات پیدا ہو چکے ہیں یا نہیں جن میں ایک سے زیادہ بیویوں کی ضرورت لاحق ہو۔ جب ایسے حالات پیدا ہو جائیں تو پھر ان "بے شوہر عورتوں" کو جنہیں خاندان بنانے کے لئے ایک سے زیادہ بیویوں کی اجازت ہو سکتی ہے۔ اور یہ بھی صرف ان کیلئے جو بیویوں میں باہمی عدل کر سکیں (چونکہ اس مسئلہ کے متعلق ہم متعدد بار شرح و بسط سے لکھ چکے ہیں اس لئے اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ جو حضرات اس موضوع سے زیادہ دلچسپی رکھتے ہوں وہ ادارہ کی طرف سے شائع کردہ کتاب "طاہرہ کے نام خطوط" کا مطالعہ فرمالیں۔ اس میں عورتوں سے متعلق تمام قرآنی احکام تفصیل سے درج ہیں)۔

تصریحاتِ بالا سے یہ حقیقت سامنے آگئی ہوگی کہ آرڈیننس کی یہ دفعہ بھی قرآنی منشاء سے پیچھے ہے۔ لیکن چونکہ اس سے موجودہ صورت حالات کی اصلاح کی طرف قدم بڑھتا ہے۔ اس لئے ہم اس کا بھی استقبال کرتے ہیں اس امید اور درخواست کے ساتھ کہ حکومت اس دفعہ کو قرآن کے بالکلیہ مطابق بنانے میں ضروری اقدامات کرے گی۔

اگلی دفعہ طلاق سے متعلق ہے۔ طلاق کے ضمن میں ہمارے مروجہ (غیر قرآنی) قوانینِ شریعت نے اس قدر الجھاؤ پیدا کر رکھا ہے کہ اس سے نہ صرف عجیب و غریب قسم کی مضحکہ انگیز پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ بلکہ حلالہ جیسی انسانیت سوز حرکت سے بھی دوچار ہونا پڑتا ہے۔ قرآن کریم نے اس کے لئے صاف اور واضح احکام دیئے ہیں (جنہیں ہم نے سوالنامہ کے جواب میں بصراحت لکھ دیا تھا)۔ ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس آرڈیننس میں اصولاً قرآن کریم کے احکام اور طریق کو ملحوظ رکھا گیا ہے جس سے اس "مشکل ترین" مسئلہ کا آسان ترین حل سامنے آجاتا ہے۔

اس سلسلہ میں البتہ ایک چیز ایسی ہے جو بھی قرآنی تعلیم سے پیچھے ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ اگر عورت کو طلاق کا حق خاص طور پر تفویض کیا گیا ہو تو وہ اُسے حاصل کر سکتی ہے۔ بصورت دیگر وہ انفساخِ نکاح کیلئے وہی طریق اختیار کر سکتی ہے جو مرد کیلئے طلاق کی صورت میں تجویز کیا گیا ہے۔ قرآن کی رُو سے معاہدۂ نکاح سے رشتہ گاری کا حق مرد اور عورت دونوں کو یکساں طور پر حاصل ہے۔ اس لئے نہ تو اس کی رُو سے) عورت کو حق طلاق تفویض کئے جانے کا سوال پیدا ہوتا ہے اور نہ ہی اس کیلئے "طلاق" کی بجائے "انفساخِ نکاح" کی اصطلاح استعمال کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اتنی ترمیم ہو جانے سے یہ دفعہ قرآن کے عین مطابق ہو سکتی ہے۔ (طلاق کے متعلق تفصیلی احکام بھی "طاہرہ کے نام خطوط" میں ملینگے)۔

آرڈیننس میں ایک دفعہ اس کی بابت بھی شامل کر دی گئی ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کی کفالت میں کوتاہی برتے تو معاملہ ثالثی کونسل کے روبرو پیش کیا جائے۔ اسی طرح اس میں یہ بھی مذکور ہے کہ اگر نکاح نامہ میں اس امر کی صراحت نہ کی گئی ہو کہ زوجہ کس طرح ادا کیا جائے گا تو اسے عند الطلب واجب الادا تصور کیا جائے گا۔ ان دفعات کی رُو سے اُن مظالم کا بڑی حد تک ازالہ ہو جائیگا جو اس مظلوم طبقہ پر روا رکھے جاتے ہیں۔

نکاح کی عمر کے متعلق بلوغت کی شرط کی صراحت کے ساتھ بلوغت کی عمر کا بھی تعین کر دیا گیا ہے۔ بلوغت کی شرط قرآن کے عین مطابق ہے۔

یہ ہیں مختصراً اس آرڈیننس کی دفعات جنہیں ہمارا قدامت پرست طبقہ خلافِ شریعت قرار دے رہا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ قوانین قرآن کے احکام یا تعلیم اور منشاء کے خلاف ہیں؟ اگر یہ قرآن کے خلاف نہیں تو پھر یہ شریعتِ اسلامی کے عین مطابق ہیں۔ اس لئے

(بقیہ صفحہ ۸۰ پر)

بسم اللہ تعالیٰ

رسالت کی آئینی حیثیت

کے

اہم موضوع پر

ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب اور سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب

کے مابین خط و کتابت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رسالت کی آئینی حیثیت

گذشتہ سال ماہنامہ ترجمان القرآن میں ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب اور سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کے مابین خط و کتابت کا سلسلہ شائع ہونا شروع ہوا۔ اس کی ابتدا ترجمان القرآن کی جولائی ۱۹۶۰ء کی اشاعت سے ہوئی۔ اور مودودی صاحب کا آخری جواب اس کی دسمبر کی اشاعت میں چھپا۔ موضوعِ بحث یہ اہم سوال تھا کہ سُنّتِ رسولؐ اللہ کا متعیّن مفہوم کیا ہے۔ اور آج یہ سُنّت قرآن کی طرح یقینی طور پر کہاں مل سکتی ہے۔ اس اُصولی موضوع کے تحت جس قدر ذیلی سوالات پیدا کئے جا سکتے ہیں وہ ظاہر ہیں۔

اس خط و کتابت کو دیکھکر قارئینِ ترجمان القرآن اور قارئینِ طلوعِ اسلام میں سے اکثر نے ہمیں لکھا کہ طلوعِ اسلام کے لئے ضروری ہے کہ اس بحث میں حصّہ لے۔ ایک تو اس لئے کہ یہ مسائل ایسے ہیں کہ جن کے متعلق طلوعِ اسلام میں اکثر بحث ہوتی رہتی ہے، اور دوسرے اس لئے کہ مودودی صاحب اپنے جوابات میں موقع بے موقع طلوعِ اسلام کو خواہ مخواہ درمیان میں گھسیٹتے چلے آ رہے تھے۔ لیکن ہم نے اس بحث میں حصّہ لینا ضروری نہ سمجھا۔ اس لئے کہ جب دو آدمیوں میں بات ہو رہی ہو تو تیسرا خواہ مخواہ دخیل کیوں ہو۔

مودودی صاحب کا جواب دسمبر ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا، اور اس کے بعد ترجمان القرآن میں اس موضوع کے متعلق کچھ سامنے نہ آیا۔ اس پر لوگوں کی طرف سے پھر اصرار شروع ہوا کہ مودودی صاحب کے جواب نے بہت سی غلط فہمیاں پیدا کر دی ہیں، اور ڈاکٹر صاحب خاموش ہیں۔ اس لئے طلوعِ اسلام کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان غلط فہمیوں کا ازالہ کرے۔ بالخصوص اس لئے کہ ڈاکٹر صاحب اور مودودی صاحب میں بات کسی نجی معاملہ کے متعلق نہیں ہو رہی تھی، بلکہ موضوعِ سخن ایسا تھا جو دین سے دلچسپی رکھنے والوں کے نزدیک خاص اہمیت رکھتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ انھوں نے اپنا جواب جنوری ۱۹۶۱ء میں بھیج دیا تھا، لیکن مودودی صاحب نے اُسے ابھی تک شائع نہیں کیا۔ نہ ہی وہ متعیّن طور پر بتاتے ہیں کہ وہ اُسے شائع کریں گے تو کب تک۔ ڈاکٹر

صاحب نے یہ بھی کہا کہ اس وجہ سے انھوں نے اپنا جواب دوسرے اخبارات (یا رسائل) میں اشاعت کیلئے بھیجدیا ہے۔

ایسی صورت میں ہم نے ضروری سمجھا کہ ڈاکٹر صاحب کا جواب طلوعِ اسلام میں بھی شائع کر دیا جائے۔ تاکہ اس کے حلقۂ قارئین میں سے جن احباب نے اس موضوع سے اس قدر دلچسپی کا اظہار کیا تھا اُن کا تقاضا پورا ہو جائے۔ ویسے بھی ان کے جواب میں بعض ایسے گوشے سامنے آگئے ہیں۔ جو اس ضمن میں خاص اہمیت رکھتے ہیں اور جن کا مطالعہ ان تمام حضرات کے لئے فائدہ کا موجب ہوگا جو دین کے اس بنیادی مسئلہ سے دلچسپی رکھتے ہیں۔

بظاہر ایسا دکھائی دیگا کہ جب تک مودودی صاحب کا خط سامنے نہ ہو، ڈاکٹر صاحب کا جواب سمجھ میں نہیں آسکتا۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کا خط ایسا جامع اور خود مکتفی ہے کہ اس سے مطلب واضح ہو جاتا ہے۔

ہمیں نہ مودودی صاحب کی ذات سے کوئی تعلق ہے اور نہ ہی ڈاکٹر صاحب کی شخصیت سے کوئی واسطہ ہم اس بحث کو خالص علمی اور دینی نقطۂ نگاہ سے شائع کر رہے ہیں ——— اور بلا تنقید و تبصرہ ——— صرف عنوانات ہمارے ہیں۔

چونکہ اس خط کا بیک وقت پورے کا پورا سامنے آجانا ضروری ہے اس لئے ہم قارئین سے معذرت خواہ ہیں کہ زیرِ نظر اشاعت میں دیگر عنوانات اور مقالات کے لئے گنجائش نہیں رہی۔

لیجئے۔ اب پہلے ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب کے قلم سے اس بحث کا تعارف ملاحظہ کیجئے، اور اس کے بعد مودودی صاحب کے نام اُن کا خط۔

طلوعِ اسلام۔

تعارف

پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کے بعد سوائے اُن مٹھی بھر لوگوں کے جو اسلام کے نام سے بدکتے ہیں ہر گوشے سے یہ آواز اُٹھ رہی ہے کہ پاکستان کا آئین اسلامی ہونا چاہیئے۔ اور اس سلسلہ میں ایک اہم ترین مسئلہ یہ رہا ہے کہ اس آئین کی بنیاد کتاب و سنّت پر ہو۔

میرے ذہن میں اس مسئلہ سے متعلق ایک اشکال و ابہام سا موجود تھا۔ اور جن احباب سے میں نے اس موضوع پر تبادلۂ خیال کیا۔ اُنھیں بھی کم و بیش اسی اشکال میں مبتلا پایا۔ گزشتہ سال آئین کمیشن کا سوالنامہ شائع ہونے کے بعد اُنیس علماء کے متفقہ جوابات سامنے آئے۔ ان علماء کا مطالبہ بھی یہی تھا کہ آئین کی بنیاد کتاب و سنّت پر ہو۔ چنانچہ گزشتہ مئی میں میں نے اس اشکال کے حل کے لئے ان علمائے کرام کی طرف رجوع کیا۔ اور ایک خط کے ذریعہ اپنے مقصد اور

نقطۂ نظر کو پوری وضاحت سے ان کی خدمت میں پیش کر دیا۔ میرے سوالات مندرجۂ ذیل تھے۔

۱۔ آپ کے نزدیک سنّت سے کیا مراد ہے۔ یعنی جس طرح کتاب سے مراد قرآن مجید ہے، بعینہٖ اسی طرح سنّت سے کیا مراد ہے؟

۲۔ کیا (قرآن کی طرح) ہمارے ہاں کوئی ایسی کتاب موجود ہے جس میں سنّت رسول اللہؐ مرتب شکل میں موجود ہو یعنی قرآن کی طرح اس کی بھی کوئی جامع و مانع کتاب موجود ہے؟

۳۔ کیا سنّتِ رسول اللہؐ کی اس کتاب کا متن تمام مسلمانوں کے نزدیک اسی طرح متفق علیہ اور شک و تنقید سے بالاتر ہے جس طرح قرآن مجید کا متن؟

۴۔ اگر کوئی ایسی کتاب موجود نہیں، تو جس طرح یہ بآسانی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ فلاں فقرہ قرآن مجید کی آیت ہے یا نہیں، اسی طرح یہ کیونکر معلوم کیا جائیگا کہ فلاں بات سنّتِ رسول اللہؐ ہے یا نہیں؟

میرا خیال تھا کہ اگر ان علمائے کرام کی طرف سے میرے مختصر سے سوالات کے متعین اور اطمینان بخش جوابات موصول ہو گئے تو اُن کی اشاعت سے بہت سی اُلجھنیں ختم ہو جائیں گی اور فکری وحدت کے امکانات روشن ہو جائیں گے۔ لیکن یہ انتہائی افسوس کا مقام ہے کہ ان حضرات میں سے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے ہی اپنے قلم کو حرکت میں لانا ضروری سمجھا اور وہ بھی اس طرح نہ واضح، دو ٹوک اور متعین جوابات کے بجائے (جس کے لئے میں نے ان سے مخلصانہ اپیل کی تھی) انہوں نے میری توجہ اس مراسلت کی طرف دلائی جو اُن کے اور مسٹر جسٹس رحمٰن صاحب کے درمیان ہوئی تھی۔ اور جو ترجمان القرآن جنوری ۱۹۵۸ء و دسمبر ۱۹۵۸ء میں شائع ہوئی تھی۔ مولانا نے مجھے ہدایت فرمائی کہ میں اس کا مطالعہ کروں، کیونکہ میرے سوالات کا جواب اس خط و کتابت میں موجود ہے۔ لیکن اس مراسلت کو پڑھنے کے بعد میں مطمئن نہ ہو سکا چنانچہ مزید وضاحت کے لئے میں نے مولانا کی خدمت میں چند اور سوالات پیش کئے۔ اس پر مولانا نے اپنی جوابی مراسلت کو طویل تحریروں کا اکھاڑہ بنا دیا۔

میرے مختصر اور سیدھے سادھے خطوط کے ساتھ ان جوابات کی اشاعت ترجمان القرآن میں بیسیوں صفحات پر پھیلتی چلی گئی اور خود مولانا کے زیر ادارت یہ سلسلہ گزشتہ ماہ دسمبر تک پورے اہتمام و انصرام سے جاری رہا۔

اس دوران میں ان کے مسلکِ فکر اور حلقۂ عقیدت سے وابستہ دیگر جرائد کو نا قوسِ خصوصی کے طور پر حرکت میں لایا گیا۔ اور صحافتی دیانت اور ذمہ داری کے تمام تقاضوں کو بالائے طاق رکھکر انھوں نے مودودی صاحب کے خطوط کی کیفیر اشاعت کے ساتھ ذیلی عنوانات اور ضمنی سرخیوں سے وہ وہ اضافے کئے اور وہ کچھ مجھ سے منسوب کیا جس کا میرے مکتوب میں ذکر تک نہ تھا۔ اور جس سے یہ واضح ہو گیا کہ انتہائی سنجیدہ علمی و دینی بحث میں بھی یہ حضرات کس اخلاقی سطح کو اپنا سکتے ہیں۔ مجھے یقین ہو گیا کہ ان اہم مسائل کو سلجھانے اور مجھے مطمئن کرنے کے بجائے مودودی صاحب اپنے لئے دریل

سستی شہرت کا میدان تیار کرنے میں مصروف ہیں۔

یہ تھی وہ صورت جبکہ مورخہ ۱۶ر جنوری ۱۹۶۱ء کو میں نے مولانا کی تحریروں کے تضادات اور ان سے پیدا شدہ گمراہ کن الجھنوں کی نشاندہی کے طور پر انھیں تفصیلی خط لکھا۔ تاحال مولانا میرے اُس خط کی اشاعت کے متعلق تذبذب میں ہیں۔ اور انتہائی اصرار کے باوجود ابھی تک متعین طور پر یہ بتانے کے قابل نہیں ہوئے کہ وہ اسے کب شائع کریں گے۔ ۹ر فروری کے ایک خط میں انھوں نے صرف یہی لکھا ہے کہ یہ کام جلدی نہیں ہوسکتا۔ لیکن چونکہ مجھے عرصہ دو ماہ سے مسلسل اور مختلف جگہوں سے خطوط آرہے ہیں کہ میں مولانا کے خطوط کا جواب دوں۔ اس لئے میرے لئے یہ ضروری ہوگیا ہے کہ سلسلۂ مراسلت کی ایک مربوط کڑی کے طور پر اس خط کو حوالۂ اشاعت کردوں۔ تاکہ علمی حلقوں کے سامنے تصویر کا دوسرا رُخ بھی اپنے حقیقی رنگ میں واضح ہوکر آجائے۔

میں طبعاً یہ پسند نہیں کرتا کہ علمی مباحث میں تلخ لب ولہجہ سے کام لیا جائے اور امکان کی آخری حد تک میں نے اس احساس کو پیشِ نظر رکھا۔ لیکن جن قارئین نے 'ترجمان القرآن' اور 'ایشیا' وغیرہ میں شائع شدہ مودودی صاحب کے خطوط کا اندازِ تحریر ملاحظہ کیا ہے وہ اس سے اتفاق کریں گے کہ آخرالامر ایک سنجیدہ مزاج انسان بھی جواباً اس پر مجبور ہوجاتا ہے کہ جو شخص جس انداز میں بات کرنے اور سمجھنے کا عادی ہو اس سے اسی انداز میں بات کی جائے تاکہ وہ حسبِ عادت اُسے آسانی سے سمجھنے کے قابل ہوسکے۔ میرے اس مکتوب میں بعض مقامات پر تلخ انداز کی کیفیت اگرچہ میرے طبعی منشاء کے خلاف ہے۔ لیکن تاہم وہ اسی مجبوری کی آئینہ دار ہے۔

مجھے یہ بھی واضح کردینا چاہیئے کہ زیرِ نظر مکتوب مودودی صاحب کے طویل اور پورے سلسلۂ مراسلت کا ایک مجموعی تجزیہ ہے۔ اپنے مختصر خطوط کے بعد میرے لئے یہ ضروری تھا کہ ان کے اس سلسلۂ دراز کا تفصیلی جواب دوں۔ اس لئے مجھے یقین ہے کہ اس ایک مکتوب سے موضوعِ زیرِ بحث کے تمام گوشے قارئین کے سامنے آجائیں گے۔

میرا مکتوب مورخہ ۱۶ر جنوری حسبِ ذیل ہے:-

ڈاکٹر سیّد عبدالودود صاحب کا خط بنام سیّد ابوالاعلیٰ صاحب مودودی

باسمہٖ سبحانہ۔ مورخہ ۱۶ر جنوری ۱۹۶۱ء

مولانائے محترم۔ السلام علیکم۔

آپ کا آخری خط مجھے مل گیا تھا۔ تکلیف فرمائی کے لئے شکرگزار ہوں۔ میرے سامنے اس وقت وہ چاروں رسائل

ہیں جن میں آپ نے اس خط و کتابت کو شائع فرمایا ہے۔ یعنی ترجمان القرآن بابت جولائی و اکتوبر، و نومبر و دسمبر ۱۹۶۰ء

۱۔ اس خط میں میرا مقصد اُن الجھنوں کا بیان کرنا ہے جو آپ کے اِس قدر طول و طویل جوابات نے پیدا کر دیں بلکہ بڑھا دی ہیں۔ اور ان غلطیوں کی طرف اشارہ کرنا ہے جو قرآن کریم کو سمجھنے میں آپ سے سرزد ہوئی ہیں۔ اور جن کی وجہ سے میری قرآنی بصیرت کے مطابق آپ اپنی گمراہی کا بوجھ بھی اٹھائے ہوئے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ان عوام الناس کا بھی جو آپ کی وجہ سے گمراہ ہو رہے ہیں۔ ان بیچاروں کی حالت اور بھی زیادہ قابلِ رحم ہے۔ اس لئے کہ آپ کے ہاتھوں سے اگر دین کا سررشتہ چھوٹا ہے تو کم از کم دنیاوی مفاد تو حاصل ہو گئے ہیں۔ ان بیچاروں کا دین اور دنیا دونوں میں خسران ہے۔

طلوعِ اسلام کا بوس

۲۔ قبل اس کے کہ میں اصل موضوع کی طرف آؤں دو ایک باتیں گلے کے طور پر پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ آپ نے اس خط و کتابت کی ابتدا ان الفاظ سے کی ہے:۔

"ذیل میں وہ مراسلت درج کی جا رہی ہے جو 'بزمِ طلوعِ اسلام' کے ایک نمایاں فرد ڈاکٹر عبد الودود صاحب اور مدیر ترجمان القرآن کے درمیان سنت کو اسلام کے آئین کی بنیاد ماننے کے مسئلے پر ہوئی ہے۔" (ترجمان القرآن۔ جولائی صفحہ ۲۱۹)

اس کے بعد آپ نے اسی اشاعت کے صفحہ ۲۴۷ پر لکھا ہے کہ:۔

"میں ایسی باتوں کی آپ جیسے معقول انسان سے توقع نہ رکھتا تھا۔ مگر یہ شاید بزمِ طلوعِ اسلام کا فیض ہے کہ اُس نے آپ کو بھی یہاں تک پہنچا دیا۔"

چند سطریں آگے چل کر آپ نے لکھا ہے:۔

"آپ بھی اس خط و کتابت کو "طلوعِ اسلام" کی کسی قریبی اشاعت میں درج کرنے کا انتظام فرمائیں۔ تاکہ دونوں طرف کے عوام اس سے آگاہ ہو کر پریشانی سے نجات پا سکیں۔"

میں نے اپنے خط مورخہ ۱۳ر جولائی میں وضاحت سے آپ کو لکھ دیا تھا کہ:۔

"یہ حقیقت شاید آپ کی نگاہوں سے اوجھل ہو کہ میں بزمِ طلوعِ اسلام کا 'اہم فرد' تو درکنار اس کا ابتدائی یا معمولی رکن تک نہیں۔ ہاں البتہ طلوعِ اسلام کے لٹریچر سے متاثر ضرور ہوں۔ بالخصوص اس کے اُس حصّے سے جس میں اسلامی نظام کا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ چونکہ اس موضوع سے مجھے گہری فکری و نظری دلچسپی رہی ہے، اس لئے اس موضوع کے ہر گوشے کا کما حقہٗ تعارف حاصل کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ اِس معاملہ

میں آپ کے لٹریچر سے بھی حتی الوسع مستفید ہونے کی پوری کوشش کی ہے ۔۔۔۔۔"

میں نے اس کے بعد ایک دوسرے خط میں یہ بھی تاکیداً لکھا تھا کہ آپ اس وضاحتی خط کو شائع کریں۔ آپ نے نہ صرف یہ کہ اس خط کو شائع نہیں کیا بلکہ مزید شائع شدہ خط و کتابت میں اس کا اشارہ تک نہیں کیا۔ حالانکہ دیانت کا تقاضا تھا کہ میری اس وضاحت کے بعد آپ اپنی غلطی کا اعتراف کرتے اور معذرت چاہتے۔ یہ آپ کی پرانی تکنیک ہے کہ جن لوگوں سے آپ کو کوئی اختلاف ہو، اور اُن کے سوالات کا جواب آپ سے بن نہ پڑے تو آپ اُن کے خلاف الزام تراشیوں اور افترا پردازیوں کی بوچھاڑ شروع کر دیا کرتے ہیں، تاکہ اُن کے خلاف آپ کے عقیدتمندوں کے جذبات مشتعل ہو جائیں اور وہ کھرے اور کھوٹے میں تمیز کرنے کے قابل ہی نہ رہیں۔

بدظنی

۳۔ آپ نے یہی سیاسی حربہ آگے چل کر بھی استعمال فرمایا ہے۔ جہاں آپ لکھتے ہیں:۔

"آپ نے یہ مراسلت واقعی بات سمجھنے کے لئے کی ہوتی تو سیدھی بات سیدھی طرح آپ کی سمجھ میں آجاتی، لیکن آپ کی تو سکیم ہی کچھ اور تھی۔ آپ نے اپنے ابتدائی سوالات میرے پاس بھیجنے کے ساتھ ساتھ کچھ دوسرے علماء کے پاس بھی اس امید پر بھیجے تھے کہ ان سے مختلف جوابات حاصل ہوں گے، اور پھر اُن کا مجموعہ شائع کر کے یہ پروپیگنڈہ کیا جا سکے گا کہ علماء سُنّت سُنّت تو کرتے ہیں مگر وہ عالم بھی سُنّت کے بارے میں ایک متفقہ رائے نہیں رکھتے۔" (ترجمان القرآن۔ دسمبر ۱۹۶۰ء صفحہ ۱۷۷)

کیا میں آپ سے پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کو میری اس "سکیم" کا علم کیسے ہوا؟ کیا آپ کے پاس اس کا کوئی ثبوت ہے کہ میری نیت وہی تھی جسے آپ میری طرف منسوب کر رہے ہیں؟۔ بیشک میں نے ان سوالات کو متعدد حضرات کے پاس بھیجا تھا، اس لئے کہ میرے نزدیک یہ مسائل اتنے اہم تھے کہ میں ان کے متعلق ہر گوشے سے معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ میں یہی کوشش اب بھی جاری رکھوں گا کہ دوسرے علماء سے اپنے سوالات کا جواب لوں۔ گو میں اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ آپ کے سوا کسی دوسرے صاحب میں اتنی اخلاقی جرأت بھی نہیں ہوئی کہ وہ میرے سوالات کو شائع ہی کر دے۔ خواہ اس کے بعد جوابات ایسے ہی بے تکے دے جیسے آپ نے دیئے ہیں۔ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ آئین کمیشن کو جو "متفقہ" جواب نامہ بھیجا گیا تھا اُس کے مصنف آپ تھے، اور باقی سب "جی حضوریئے" تھے۔

علماء کے اختلاف

باقی رہی یہ حقیقت کہ سُنّت کے بارے میں آپ حضرات کوئی متفقہ رائے نہیں رکھتے تو یہ کونسی ایسی بات تھی جس کے لئے مجھے مختلف علماء کی آراء دریافت کرنے کی ضرورت پڑتی۔ ان کی آراء لوگوں کے سامنے ہیں۔ اور ان کے اختلاف سے بھی دنیا واقف ہے۔ مثال کے طور پر آپ بھی سُنّت کے بہت بڑے مدعی ہیں۔ اور جماعتِ اہلِ حدیث کا تو مسلک ہی یہی ہے۔ لیکن سُنّت کی تفاصیل تو کجا، سُنّت کسے کہتے

ہیں؟ اس کے متعلق جمعیّت اہلِ حدیث کے ناظم کا ارشاد یہ ہے :-

"میری رائے میں مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی کے نظریات نہ صرف مسلکِ اہلِ حدیث کے خلاف ہیں بلکہ یہ نظریات تمام ائمہ اہلِ حدیث کے خلاف ہیں۔ اور ان میں آج کے جدید اعتزال اور تجہّم کے جراثیم مخفی ہیں " (جماعتِ اسلامی کا نظریۂ حدیث۔ صفحہ ۱۱۰)

حتیٰ کہ انھوں نے یہاں تک لکھ دیا ہے کہ وہ آپ کے نظریہ کی آخری حد تک مزاحمت کریں گے۔

"اور سنّتِ رسول ؐ کو ان ہوائی حملوں سے بچانے کی کوشش کریں گے "

(ایضاً صفحہ ۶۳)

احادیث کے متعلق ان کا مسلک یہ ہے کہ :-

" بخاری اور مسلم کی صحت پر امت متفق ہے۔ ان احادیث کی صحت قطعی ہے "

(ایضاً صفحہ ۵۵)

اور انہی احادیث کے متعلق آپ کا ارشاد یہ ہے کہ :-

" یہ دعویٰ کرنا صحیح نہیں کہ بخاری میں جتنی احادیث درج ہیں اُن کے مضامین کو بھی جُوں کا توں بلا تنقید قبول کر لینا چاہیئے " (ترجمان القرآن۔ اکتوبر و نومبر ۱۹۵۲ء)

فرمائیے! اس کے بعد یہ بتانے کے لئے کہ آپ حضرات میں اس بارے میں کتنے اختلافات ہیں، میرے کسی پروپیگنڈے کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟ آپ کو کسی کی نیت پر حملہ کرنے سے پہلے کچھ تو جھجک محسوس کرنی چاہیئے۔

وہ بُت کونسا ہے؟

۴۔ آخری خط میں آپ پوچھتے ہیں کہ :-

" آخر وہ کونسا بُت ہے جس کے آگے جُھکنے کے لئے آپ سے کہا گیا تھا؟ اور کس شخصیت پرستی کی آپ کو دعوت دی گئی تھی؟ " (ترجمان القرآن دسمبر ۱۹۶۰ء صفحہ ۱۷۹)

اس بُت کی تلاش میں آپ کو کسی مندر میں جانے کی ضرورت نہیں۔ وہ بُت آپ خود ہی ہیں۔ آپ کی زبان اور قلم سے جو کچھ نکل جائے اُسے آپ خدا اور رسولؐ کا فرمان قرار دیتے ہیں۔ اس کے سامنے جُھکنا حق کے سامنے جُھکنا ہے۔ اور آپ کے نزدیک اس سے انحراف خدا اور رسولؐ سے انحراف کے مرادف ہے۔ جو آپ سے اختلاف کرے اُس کے خلاف آپ اور آپ کے حاشیہ بردار جو کچھ کرتے ہیں ایک دنیا اس کی شاہد ہے۔ حتیٰ کہ جو لوگ برسوں تک آپ کے معتقد رہے اور اس کے بعد ان بیچاروں نے آپ کی کسی بات سے اختلاف کیا تو آپ حضرات نے جو کچھ اُن کے خلاف کیا وہ بھی سب پر عیاں ہے۔ یہی وہ آپ کا بُت ہے جس کے سامنے جھکنے کے لئے آپ مجھے کہہ رہے ہیں۔ اور میرے نہ جھکنے پر مجھے خدا اور اس کے رسولؐ سے منحرف ہو جانے کے جرمِ عظیم کا مرتکب قرار دے رہے ہیں۔

اے کاش کہ آپ کو یہ معلوم ہو سکتا کہ آپ کی اس روش نے سنجیدہ طبقے کی نگاہوں میں آپ کا وقار کس قدر کھو دیا ہے۔

بات کا بتنگڑ

۵۔ آپ نے میرے خطوط میں سے بعض کتابت کی غلطیوں کو اُچھال کر یہ تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہ میں قرآنی آیات کی صحیح املا تک نہیں جانتا۔ مجھے اپنی علمی حدود کا اچھی طرح سے علم ہے۔ لیکن ذرا سوچئے کہ آپ نے جو بات کہی ہے وہ کس قدر گھٹیا درجہ کی ہے۔ میرے خطوط کی کتابت کسی اور صاحب نے کی تھی۔ کتابت میں عام طور پر جو غلطیاں رہ جاتی ہیں اس کا کسے علم نہیں۔ مجھے اگر آپ کی اس ذہنیت کا علم ہوتا تو میں ان آیات کو خود چیک کر لیتا۔ اس کا تو آپ کو بھی تجربہ ہو گا کہ آپ کی اتنی علمیت اور احتیاط کے باوجود خود آپ کی کتابوں میں کتابت کی کتنی غلطیاں رہ جاتی ہیں۔ کیا ان غلطیوں کی بناء پر آپ کو جاہل قرار دیا جائے؟

مجھے افسوس ہے کہ مجھے تمہید میں یہ کچھ لکھنا پڑا۔ لیکن اس سے بھی میرا مقصد یہ ہے کہ شاید اس سے آپ اپنی اصلاح فرما سکیں۔ اپنے عقیدتمندوں کے حلقہ میں رہنے والوں کی کیفیت یہی ہوتی ہے کہ ان میں سے انھیں کوئی بھی یہ بتانے کی جرأت نہیں کرتا کہ ع۔

کہتی ہے تم کو خلقِ خدا غائبانہ کیا

اس لئے ضرورت ہوتی ہے کہ کوئی غیر جانبدار آگے بڑھ کر ان کے سامنے آئینہ رکھ دے۔ جس میں انھیں اپنے حقیقی خط و خال نظر آ جائیں۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ اس حبشی کی طرح جس نے آئینے میں اپنے بھیانک خط و خال دیکھ کر آئینے کو پتھر پر دے مارا تھا۔ اس انکشافِ حقیقت سے گالیوں پر اُتر آئے۔

سنّت کسے کہتے ہیں؟

میں نے اپنے سوالات کی غرض و غایت بیان کرتے ہوئے لکھا تھا کہ مملکتِ پاکستان کے لئے اسلامی آئین مرتب کرنے کے سلسلہ میں یہ مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ اس آئین کی بنیاد کتاب و سنّت پر رکھی جانی چاہیئے جس کا مطلب یہ ہے کہ ملک میں کوئی ایسا قانون نہ رہنے پائے نہ بننے پائے جو کتاب و سُنّت کے خلاف ہو۔

میں نے یہ کہا تھا کہ اس مقصد کے لئے یہ اشد ضروری ہے کہ جس طرح قرآن کے متعلق ہر شخص کو معلوم ہے کہ یہ ایک متعین کتاب کا نام ہے جس میں پہلے لفظ سے آخری لفظ تک جو کچھ درج ہے حرفاً حرفاً خدا کا کلام ہے۔ اسی طرح یہ بھی متعین طور پر معلوم ہونا چاہیئے کہ سُنّتِ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کسے کہتے ہیں، اور وہ کس جگہ اس شکل میں مل سکے گی کہ اس کے متعلق متفق علیہ طور پر کہا جا سکے کہ وہ حرفاً حرفاً سنّتِ رسول اللہ ہے۔ تاکہ جب یہ سوال پیدا ہو کہ فلاں قانون کتاب و سُنّت کے خلاف ہے یا نہیں تو اس وقت یہ بحث نہ شروع ہو جائے کہ صحیح سنّتِ رسول اللہ ہے کیا؟

آپ نے اس کے جواب میں اپنی ہمہ دانی اور مستفسر کی جہالت کے متعلق بیسیوں صفحات سیاہ کر ڈالے، لیکن ان سوالات کے متعلق جو کچھ کہا وہ اس سے زیادہ کیا ہے کہ ان کا جواب آپ کے پاس نہیں ہے۔

اس پر مجھے بے ساختہ اس لال بجھکڑ کی بات یاد آرہی ہے کہ جس کے گاؤں سے ایک دفعہ ایک ہاتھی گزرا۔ اس کے عقیدتمندوں کا حلقہ اس کے گرد جمع ہوگیا اور اُس سے یہ پوچھا کہ یہ کیا تھا جو گزرا ہے۔ یہ سُن کر لال بجھکڑ صاحب زار و قطار رونے لگ گئے۔ انھیں دیکھ کر عقیدتمند بھی آنسو بہانے لگے۔ جب کچھ سکون ہوا تو انھوں نے پوچھا کہ حضور آپ کے رونے کا باعث کیا تھا؟۔ انھوں نے ٹھنڈی سانس بھری اور کہا کہ مجھے رونا اس بات پر آگیا کہ اب تو تمہاری یہ حالت ہے کہ جہاں کوئی مشکل بات سامنے آئی آپ لوگ دوڑ کر میرے پاس آگئے اور اطمینان کر لیا۔ کل جب میں نہیں ہوں گا تو تمھیں یہ باتیں کون بتایا کرے گا۔ اس پر عقیدتمندوں کا حلقہ پھر رونے لگ گیا۔ سکون ہونے پر انھوں نے پھر پوچھا کہ حضرت! اب فرمائیے کہ یہ کیا تھا جو گزرا ہے۔ لال بجھکڑ صاحب نے جواباً فرمایا کہ اس کا تو مجھے بھی علم نہیں کہ یہ کیا تھا۔

آپ میں اور اس لال بجھکڑ میں فرق یہ ہے کہ اس میں اپنی لاعلمی کے اعتراف کی جرأت تھی، لیکن آپ اسے طومار نویسی کے پردوں میں چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ تاکہ عقیدتمندوں کے حلقہ میں آپ کا بھرم قائم رہے۔

۶۔ میرا پہلا سوال یہ تھا کہ سُنّت سے آپ کی کیا مراد ہے؟ اس کے جواب میں آپ نے سیدھی صاف اور دو ٹوک بات کہنے کے بجائے جو کچھ بیسیوں صفحات میں لکھا ہے، اُس کا ملخص یہ ہے کہ حضورؐ نے اپنی تیئیس سالہ پیغمبرانہ زندگی میں جو کچھ کیا یا فرمایا وہ واجب الاتباع سُنّت ہے۔ لیکن جو کچھ آپ نے شخصی حیثیت سے فرمایا یا عملاً کیا وہ واجب الاتباع سُنّت نہیں۔ یعنی آپ نے نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے رسول ہونے اور انسان ہونے کی حیثیتوں میں فرق کیا ہے (ترجمان القرآن بابت جولائی ۱۹۶۰ء)۔ لیکن میری مشکل یہ ہے کہ آپ دوسرے مقام پر خود اس کے خلاف لکھتے ہیں۔

حضورؐ کی دو حیثیتیں

خود اپنے خلاف

آپ نے مولانا اسلم جیراج پوری (مرحوم) کی کتاب پر تنقید کرتے ہوئے لکھا تھا:۔

"لیکن یہ تفریق جو انھوں نے محمد ابن عبداللہ اور محمد رسول اللہ بحیثیت مبلغ کے درمیان کی ہے قرآن مجید سے ہرگز ثابت نہیں۔ قرآن میں آنحضرتؐ کی ایک ہی حیثیت بیان کی گئی ہے۔ اور وہ رسول و نبی ہونے کی حیثیت ہے۔ جس وقت اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو منصب رسالت سے سرفراز کیا، اُس وقت سے لیکر حیاتِ انسانی کے آخری سانس تک آپ ہر آن اور ہر حال میں خدا کے رسول تھے۔ آپؐ کا ہر فعل اور ہر قول رسولِ خدا کی حیثیت سے تھا۔ حتیٰ کہ آپؐ کے نجی اور خاندانی اور شہری زندگی کے تمام معاملات بھی اس حیثیت کے تابع آگئے تھے۔ قرآن مجید میں کہیں کوئی خفیف سے خفیف اشارہ بھی ایسا نہیں ملتا جس کی بنا پر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی حیثیت رسالت اور حیثیتِ

انسانی اور حیثیتِ امارت میں کوئی فرق کیا گیا ہو۔ میں کہتا ہوں کہ آنحضرتؐ جس وقت جس حالت میں، جو کچھ بھی کرتے تھے رسول کی حیثیت سے کرتے تھے۔" (تفہیمات حصۂ اول۔ صفحات ۲۴۱ — ۲۴۳)

یعنی اُس وقت آپ نے یہ فرمایا تھا کہ قرآن میں کہیں کوئی خفیف سے خفیف اشارہ بھی ایسا نہیں ملتا جس کی بناء پر حضورؐ کی رسالت کی حیثیت اور شخصی حیثیت میں کوئی فرق کیا گیا ہو۔ اور اب آپ فرماتے ہیں کہ جو کچھ آپ نے رسول کی حیثیت سے کیا تھا وہ سنّت واجب الاتباع ہے۔ اور جو کچھ آپ نے شخصی حیثیت سے کیا تھا وہ واجب الاتباع سنّت نہیں۔ اس باب میں آپ نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ :-

"جو امور آپؐ نے عادتاً کئے ہیں اُنہیں سنّت بنا دینا اور تمام دنیا کے انسانوں سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ سب ان عادات کو اختیار کریں۔ اللہ اور رسولؐ کا ہرگز ہرگز یہ منشا نہ تھا۔ یہ دین میں تحریف ہے۔"
(رسائل و مسائل صفحہ ۱۹)

اس سے ذرا آگے چل کر آپ نے تحریر فرمایا ہے :-

"میں یہ عقیدہ رکھتا ہوں کہ اس قسم کی چیزوں کو سنّت قرار دے دینا، اور پھر ان کے اتباع پر اصرار کرنا ایک سخت قسم کی بدعت اور ایک خطرناک تحریفِ دین ہے۔ جس سے نہایت برے نتائج پہلے بھی ظاہر ہوتے رہے ہیں، اور آئندہ بھی ظاہر ہونے کا خطرہ ہے۔" (ایضاً صفحہ ۲۸)

ایک اور تفریق

۷۔ پھر جن باتوں کے متعلق آپ تسلیم کرتے ہیں کہ حضورؐ نے انہیں بحیثیت رسول ارشاد فرمایا تھا اُن کے اتباع میں بھی آپ فرق کرتے ہیں۔ چنانچہ آپ نے تفہیمات حصۂ اوّل صفحہ ۲۷۹ پر لکھا ہے :-

"جو امور براہِ راست دین اور شریعت سے تعلق رکھتے ہیں ان میں تو حضورؐ کے ارشادات کی اطاعت اور آپ کے عمل کی پیروی طابق النعل بالنعل کرنی ضروری ہے۔ مثلاً نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ اور طہارت وغیرہ مسائل۔ ان میں جو کچھ آپ نے حکم دیا ہے اور جس طرح خود عمل کر کے بتایا ہے اس کی ٹھیک ٹھیک پیروی کرنی لازم ہے۔ رہے وہ امور جو براہِ راست دین سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً تمدنی۔ معاشی اور سیاسی معاملات اور معاشرت کے جزئیات، تو ان میں بعض چیزیں ایسی ہیں جن کا حضورؐ نے حکم دیا ہے۔ یا جن سے بچنے کی حضورؐ نے تاکید فرمائی ہے۔ بعض ایسی ہیں جن میں حضورؐ نے حکمت اور نصیحت کی باتیں ارشاد فرمائی ہیں۔ اور بعض ایسی ہیں جن میں حضورؐ کے طرزِ عمل سے ہمیں مکارمِ اخلاق اور تقویٰ و پاکیزگی کا سبق ملتا ہے۔ اور ہم آپ کے طریقہ کو دیکھ کر یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ عمل کے مختلف طریقوں میں سے کونسا طریقہ روحِ اسلامی سے مطابقت رکھتا ہے۔"

آپ ذرا اس بات پر بھی غور کیجئے کہ ایک طرف آپ فرماتے ہیں کہ نماز روزہ وغیرہ ایسے امور ہیں جن کا تعلق براہِ راست دین اور شریعت سے ہے۔ لیکن تمدنی، معاشی اور سیاسی معاملات کا تعلق براہِ راست دین سے نہیں۔ اور دوسری طرف آپ کا دعویٰ یہ ہے کہ اقامتِ دین سے مراد ہی اسلام کے مطابق تمدنی۔ معاشی۔ سیاسی نظام قائم کرنا ہے۔

حیرت ہے کہ اگر ان امور کا تعلق براہِ راست دین سے نہیں تو پھر اقامتِ دین سے مراد ان امور سے متعلق نظام قائم کرنا کیسے ہوگا؟

اس کے بعد اس حقیقت پر غور کیجئے کہ آئینِ مملکت میں جن امور سے بحث ہوگی اُن کا تعلق ملک کے تمدنی۔ معاشی معاشرتی مسائل سے ہوگا۔ اگر ان امور کا تعلق براہِ راست دین سے نہیں تو پھر آئینِ مملکت کے دینی یا غیر دینی ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ نیز اگر ان امور میں سُنّتِ رسول اللہ کا اتباع اس نوعیت کا نہیں، جس نوعیت کا اتباع ان امور میں ضروری ہے جو (بقول آپ کے) براہِ راست دین سے متعلق ہیں۔ (مثلاً نماز۔ روزہ وغیرہ) تو پھر ان کے متعلق یہ سوال بھی کیا اہمیت رکھے گا کہ یہ سُنّت کے مطابق ہیں یا نہیں۔

پھر اُلجھاؤ

۸۔ میں نے آپ کے جو اقتباسات اوپر نقل کئے ہیں اُن سے واضح ہوتا ہے کہ آپ کے نزدیک:-

(۱)۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیاتِ طیبہ کے ہر سانس میں جہاں اور جس حال میں بھی کچھ کیا، یا فرمایا وہ بحیثیتِ رسالت تھا۔ اور قرآن نے آپ کی شخصی حیثیت اور رسالت کی حیثیت میں کوئی فرق نہیں کیا۔

(۲)۔ حضورؐ کی شخصی حیثیت الگ تھی اور رسالت کی حیثیت الگ۔ سُنّت واجب الاتباع وہ ہے جو آپ نے رسالت کی حیثیت سے کیا یا فرمایا۔

(۳)۔ جو کچھ آپ نے بحیثیتِ رسالت کیا یا فرمایا اس کے بھی دو حصّے ہیں۔ ایک وہ امور جن کا تعلق براہِ راست دین سے ہے۔ مثلاً نماز روزہ، ان کی اطاعت طابق النعل بالنعل کی جائے گی۔ دوسرے وہ امور جن کا تعلق براہِ راست دین سے نہیں۔ مثلاً سیاسی امور۔ (ان کے متعلق جو کچھ آپ نے لکھا ہے اُسے میرا ذہن ناقص سمجھ نہ سکا۔ لیکن اتنا بہرحال ظاہر ہے کہ ان کی اطاعت اوّل الذکر کی طرح نہیں کی جائے گی)۔

۹۔ یہ ظاہر ہے کہ اگر حضورؐ کی رسالت کی حیثیت اور شخصی حیثیت میں فرق کیا جائے گا۔ اور رسالت کی حیثیت میں بھی جو کچھ آپ نے ان امور کے متعلق فرمایا۔ جن کا تعلق براہِ راست دین سے ہے، اور جن کا تعلق (آپ کے نزدیک) براہِ راست دین سے نہیں، تو پھر ان امور میں بھی فرق کرنے کی ضرورت ہوگی۔ اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان میں

فرق کون کرے گا؟

فرق کون کرے گا؟ اس کے متعلق آپ نے فرمایا ہے کہ:-

"ہم بطورِ خود یہ تفریق و تحدید کر لینے کے مجاز نہیں ہیں۔ یہ فرق دو ہی طریقوں سے ہو سکتا ہے۔ یا تو حضورؐ نے اپنے کسی قول و فعل کے متعلق خود تصریح فرما دی ہو

کہ وہ ذاتی و شخصی حیثیت سے ہے، یا پھر جو اصول شریعت حضورؐ کی دی ہوئی تعلیمات سے مستنبط ہوئے ہیں۔ ان کی روشنی میں محتاط اہل علم یہ تحقیق کریں کہ آپ کے افعال و اقوال میں سے کس نوعیت کے افعال و اقوال آپ کی پیغمبرانہ حیثیت سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور کس نوعیت کی باتوں کو ذاتی و شخصی قرار دیا جا سکتا ہے۔" (ترجمان القرآن۔ جولائی ۱۹۶۰ء صفحہ ۲۱۱)

یہ تو غالباً آپ کو بھی تسلیم ہوگا کہ اس قسم کی تصریح (بجز مستثنیات کے) احادیث کے موجودہ مجموعوں میں کہیں نہیں ملتی جس میں حضورؐ نے فرما دیا ہو کہ یہ باتیں میں انسان کی حیثیت سے کہہ رہا ہوں، یا ان امور کا تعلق دین سے نہیں۔ لہٰذا اسکے لئے امت کو اہل علم کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ اور اہل علم کے باہمی اختلافات کی جو کیفیت ہے اس کی مثال میں اوپر دے چکا ہوں۔ آپ فرمائیے کہ دین کے ایسے معاملات میں جن کا اتباع امت پر واجب ہو، جن پر مسلمانوں کی نجات کا دار و مدار ہو اور جن کے انکار سے کفر لازم آتا ہو، کیا ان کی حیثیت یہی ہونی چاہیئے کہ ان کا تعین اہل علم کی صوابدید پر چھوڑ دیا جائے۔ اور اس بے چاری کو مستقل طور پر اس کشمکش میں رہے کہ اہل علم میں کس کی تحقیق کو صحیح مانا جائے اور کسے غلط؟

احادیث کی حیثیت

یہ پوزیشن کس قدر کمزور ہے، اس کا خود آپ کو بھی اعتراف ہے۔ چنانچہ آپ نے لکھا ہے:۔

"احادیث چند انسانوں سے چند انسانوں تک پہنچتی ہوئی آئی ہیں۔ جن سے حد سے حد اگر کوئی چیز حاصل ہوتی ہے تو وہ گمان صحت ہے، نہ کہ علم الیقین۔ اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو اس خطرہ میں ڈالنا ہرگز پسند نہیں کر سکتا کہ جو امور اس کے دین میں اس قدر اہم ہوں کہ ان سے کفر اور ایمان کا فرق واقع ہوتا ہو انہیں صرف چند انسانوں کی روایت پر منحصر کر دیا جائے۔ ایسے امور کی تو نوعیت ہی اس امر کی متقاضی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو صاف صاف اپنی کتاب میں بیان فرمائے۔ اللہ کا رسولؐ انہیں اپنے پیغمبرانہ مشن کا اصل کام سمجھتے ہوئے ان کی تبلیغ عام کرے، اور وہ بالکل غیر مشتبہ طریقے سے ہر مسلمان تک پہنچا دیئے گئے ہوں۔" (رسائل و مسائل صفحہ ۶۷)

۱۰۔ اسی سے وہ اہم سوال سامنے آتا ہے جس کا جواب نہ آپ نے دیا اور نہ کسی اور گوشے سے مجھے ملا ہے۔ اور وہ سوال یہ ہے کہ اگر:۔

(۱)۔ وحی منزل من اللہ کی دو قسمیں تھیں۔ ایک وحی متلو یا وحی جلی۔ اور دوسری وحی غیر متلو یا وحی خفی۔

(۲)۔ وحی غیر متلو دین کی تکمیل کرتی تھی۔ اس کے بغیر دین ناتمام رہ جاتا تھا۔

(۳)۔ جو کچھ وحی غیر متلو میں خدا کی طرف سے دیا گیا تھا اسے قیامت تک کے لئے غیر متبدل رہنا تھا اور اس کی اطاعت ہر مسلمان کے لئے قیامت تک واجب ہے۔

(۴)۔ اور (آپ کے ارشاد کے مطابق جیسے آپ نے ایک پمفلٹ میں لکھا تھا) دین کا ۹/۱۰ حصہ وحی کے اس دوسرے حصہ کے اندر ہے تو کیا رسول اللہ کے فریضۂ رسالت میں یہ چیز داخل نہ تھی کہ حضورؐ وحی کے اس دوسرے حصہ کو بھی خود مرتب فرما کر

حضورؐ نے ایسا کیوں نہ کیا

محفوظ شکل میں اُمّت کو دے جاتے جس طرح حضورؐ نے وحی کے پہلے حصہ (قرآن) کو اُمّت کو دیا تھا۔

میرا خیال ہے کہ اس حقیقت کے تسلیم کرنے میں تو آپ کے لئے کوئی گریز کی راہ نہیں نکل سکے گی، کہ اس قسم کا کوئی مجموعہ رسول اللہؐ نے مرتب فرما کر امّت کو نہیں دیا، حتیٰ کہ حضورؐ کے بعد خلفائے راشدینؓ نے بھی کوئی ایسا مجموعہ مرتب نہ فرمایا۔

ذرا دل پر ہاتھ رکھکر سوچئے کہ اس سے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق انسان کس نتیجہ پر پہنچے گا۔ اگر وحی کا اتنا ضخیم حصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح چھوڑ گئے ہوں تو کیا اُسے فریضۂ رسالت کی ادائیگی قرار دیا جا سکتا ہے؟ آپ فرماتے ہیں کہ قرآن کی حفاظت کا جو ذمہ اللہ تعالیٰ نے لیا اسے اللہ تعالیٰ نے اس طرح پورا کیا کہ:۔

"حضورؐ سے جو قرآن لوگوں کو ملا تھا اس کو اسی زمانہ میں ہزاروں آدمیوں نے لفظ بلفظ یاد کر لیا۔ پھر ہزاروں سے لاکھوں اور لاکھوں سے کروڑوں اس کو نسلاً بعد نسلٍ یاد کرتے چلے گئے حتیٰ کہ یہ کسی طرح ممکن ہی نہ رہا کہ قرآن کا کوئی لفظ دنیا سے محو ہو جائے یا اس میں کسی وقت کوئی ردوبدل ہو، اور وہ فوراً نوٹس میں نہ آجائے۔ حفاظت کا یہ غیر معمولی انتظام آج تک دنیا کی کسی دوسری کتاب کے لئے نہیں ہو سکا اور یہی اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ ہی کا کیا ہوا انتظام ہے" (ترجمان القرآن دسمبر ۵۸ء صفحہ ۱۸۴-۱۸۵)

اس کے برعکس وحی کا دوسرا حصہ جس کی حفاظت کے متعلق آپ اب فرماتے ہیں کہ اس اہتمام کے پیچھے بھی وہی خدائی تدبیر کار فرما رہی ہے جو قرآن کی حفاظت میں کار فرما رہی ہے۔ اور اس کو جو شخص چیلنج کرتا ہے وہ دراصل قرآن کی صحت کو چیلنج کرنیکا راستہ اسلام کے دشمنوں کو دکھاتا ہے، اس کی کیفیت کیا ہے؟ اس کے متعلق مجھ سے نہیں، خود اپنے ہی الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے ——— آپ نے رسائل و مسائل صفحہ ۲۷۰ پر لکھا ہے:۔

"قولِ رسولؐ اور وہ روایات جو حدیث کی کتابوں میں ملتی ہیں، لازماً ایک ہی چیز نہیں۔ اور نہ ان روایات کو استناد کے لحاظ سے آیاتِ قرآنی کا ہم پلّہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ آیاتِ قرآنی کے مُنزّل من اللہ ہونے میں تو کسی شک کی گنجائش ہی نہیں۔ بخلاف اس کے روایات میں اس شک کی گنجائش موجود ہے، کہ جس قول یا فعل کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کیا گیا ہے وہ واقعی حضورؐ کا ہے یا نہیں"

قرآن کے متعلق تو اللہ تعالیٰ نے شروع میں ہی یہ کہہ دیا کہ ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْہِ (اس کتاب میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں)؛ اور وحی کے اس دوسرے حصہ کی کیفیت یہ ہے کہ اس میں اس شک کی گنجائش موجود ہے کہ جس قول یا فعل کو حضورؐ کی طرف منسوب کیا گیا ہے وہ واقعی حضورؐ کا ہے یا نہیں۔ فرمائیے کہ وحی مُنزّل من اللہ کی حفاظت

کو چیلنج کرنے کا دامت اسلام کے دشمنوں کو ہیں دکھارہا ہوں یا آپ دکھا رہے ہیں؟ پھر یہی نہیں کہ روایات کے متعلق یہ شکوک و شبہات کسی پہلے زمانے میں پیدا ہوئے ہوں اور اب مٹ چکے ہوں۔ ان کے متعلق آپ کا ارشاد یہ ہے کہ:-

"اصل واقعہ یہ ہے کہ کوئی روایت جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے منسوب ہو اُس کی نسبت کا صحیح و معتبر ہونا بجائے خود زیر بحث ہوتا ہے۔ آپ (فریق مقابل) کے نزدیک ہر اُس روایت کو حدیث رسولؐ مان لینا ضروری ہے جسے محدثین سند کے اعتبار سے صحیح قرار دیں۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ ضروری نہیں۔ ہم سند کی صحت کو حدیث کے صحیح ہونے کی لازمی دلیل نہیں سمجھتے۔"

(ترجمان القرآن - دسمبر ۱۹۵۸ء صفحہ ۱۶۰)

یہ تو ہوا اس طریقہ کے متعلق جس کے مطابق (بقول آپ کے) اللہ تعالیٰ نے اپنی وحی کے اس حصہ کی حفاظت فرمائی۔ باقی رہی اس کی معنوی حیثیت، سو اس کے متعلق جناب ہی کی تحقیق یہ ہے کہ:-

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یا تو نبی کے بیان کو سمجھنے میں حضرت ابوہریرہؓ سے کوئی غلطی ہوئی ہے یا وہ پوری بات سن نہیں سکے ہوں گے .... اس قسم کی غلط فہمیوں کی مثالیں متعدد روایات میں ملتی ہیں۔ جن میں سے بعض روایات نے بعض کو صاف کر دیا ہے اور بعض صاف ہونے سے رہ گئی ہیں۔ زبانی روایات میں ایسا ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہیں۔" (تفہیم احادیث نمبر مورخہ ۱۴ اکتوبر ۱۹۵۹ء)

یعنی رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) براہ راست اپنے ایک جلیل القدر صحابیؓ تک اپنی "وحی" پہنچاتے ہیں اور اس "وحی" کی وہیں یہ حالت ہو جاتی ہے کہ یا تو بقول آپ کے اس کے سمجھنے میں اس صحابی کو غلطی لگ جاتی ہے یا وہ پوری وحی سن ہی نہیں پاتے۔ ذرا سوچئے کہ جب یہی روایت رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے لیکر اڑھائی سو سال تک اسی طرح آگے بڑھتی چلی گئی ہو تو آخرالامر جو صورت بن جائے گی اُس کا نقشہ کیسا ہوگا؟ کیا خدا کی حفاظت اسی کا نام ہے؟ اس طریق حفاظت "کی کمزوری کے تو آپ خود بھی قائل ہیں جب آپ لکھتے ہیں:-

روایات میں اختلاف

"بادی النظر میں یہ بات بالکل صحیح معلوم ہوتی ہے کہ ایسی فعلی اور قولی احادیث کو تواتر کا درجہ حاصل ہونا چاہیے۔ جن کے دیکھنے اور سننے والے بکثرت ہوں۔ ان میں اختلاف نہ پایا جانا چاہیے۔ لیکن ہر شخص بادنیٰ تعمق یہ سمجھ سکتا ہے کہ جس واقعہ کو بکثرت لوگوں نے سنا ہو اُس کو نقل کرنے یا اُس کے مطابق عمل کرنے میں سب لوگ اس قدر متفق نہیں ہو سکتے کہ ان کے درمیان یک سر مو فرق نہ پایا جائے ——— مثال کے طور پر آج میں ایک تقریر کرتا ہوں اور کئی ہزار آدمی اُس کو سنتے ہیں۔ جلسہ ختم ہونے کے چند گھنٹے بعد ہی (مہینوں اور برسوں بعد نہیں بلکہ چند ہی گھنٹے بعد) لوگوں سے پوچھ لیجئے کہ مقرر نے کیا کہا؟ آپ

دیکھیں گے کہ تقریر کا مضمون نقل کرنے میں سب کا بیان یکساں نہ ہوگا۔ کوئی کسی ٹکڑے کو بیان کریگا، کوئی کسی ٹکڑے کو۔ کوئی کسی جملہ کو لفظ بلفظ نقل کریگا، کوئی اس مفہوم کو جو اُس کی سمجھ میں آیا ہے اپنے الفاظ میں بیان کریگا۔ کوئی زیادہ فہیم آدمی ہوگا اور تقریر کو ٹھیک ٹھیک سمجھ کر اس کا صحیح ملخص بیان کرے گا۔ کسی کی سمجھ زیادہ اچھی نہ ہوگی اور وہ مطلب کو اپنے الفاظ میں اچھی طرح ادا نہ کرسکے گا۔ کسی کا حافظہ اچھا ہوگا اور تقریر کے اکثر حصے لفظ بلفظ نقل کردیگا۔ کسی کی یاد اچھی نہ ہوگی، وہ نقل و روایات میں غلطیاں کرے گا۔"

(تفہیمات، جلد اوّل، صفحہ ۲۳۳)

یہ ہے وہ حفاظت جس کی اہمیت کے متعلق آپ فرماتے ہیں :۔

"ختم نبوت کا اعلان بجائے خود یہ معنی رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے مقرر کئے ہوئے آخری رسولؐ کی رہنمائی اور اس کے نقوشِ قدم کو قیامت تک زندہ رکھنے کی ذمہ داری خود لے لی ہے۔ تاکہ اس کی زندگی ہمیشہ انسانوں کی رہنمائی کرتی رہے، اور اس کے بعد کسی نئے رسول کے آنے کی ضرورت باقی نہ رہے۔"

(ترجمان القرآن، دسمبر ۱۹۵۸ء صفحہ ۱۸۵)

۱۱۔ ذرا سوچئے کہ وحی کے اس حصہ کی حفاظت کی جو شکل آپ بیان فرماتے ہیں، اُس کے بعد ایک نئے رسول کے آنے کی ضرورت آپ خود ہی ثابت نہیں کر رہے ؟۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ جو وحی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف کی گئی تھی وہ اپنی اصل شکل میں باقی نہ رہی۔ (حالانکہ اُسے حضرت عیسےٰ کے صحابہ نے مرتب کیا) کیا اسی دلیل کے مطابق آپ رسول اللہ کے بعد ایک اور رسول کے آنے کی ضرورت ثابت نہیں کر رہے ؟ آپ فرماتے ہیں کہ اس کی حفاظت کی دلیل یہ ہے کہ وضو۔ پنج وقتہ نماز۔ اذان۔ عیدین کی نمازیں۔ نکاح و طلاق و وراثت کے قاعدے وغیرہ مسلم معاشرہ میں ٹھیک اسی طرح رائج ہیں جس طرح قرآن کی آیتیں زبانوں پر چڑھی ہوں۔ اس ضمن میں گذارش ہے کہ :۔

(۱)۔ آپ کا جو اقتباس ہم نے اوپر دیا ہے۔ اُس میں آپ نے خود فرمایا ہے کہ جس واقعہ کو بکثرت لوگوں نے دیکھا ہو، یا جس تقریر کو بکثرت لوگوں نے سُنا ہو، اس کی نقل کرنے یا اس کے مطابق عمل کرنے میں سب لوگ اس پر متفق نہیں ہوسکتے، کہ ان کے درمیان یک سر مو فرق نہ پایا جائے۔ کیا اس کے بعد آپ یہ کہنے کی جرأت کرسکتے ہیں کہ جن اعمال اور ضوابط کا

عمل میں اختلاف

آپ نے ذکر کیا ہے وہ اُمت میں اسی طرح چلے آرہے ہیں جس طرح حضورؐ نے فرمایا یا کیا تھا ؟۔ اور ان میں یک سر مو فرق نہیں آیا ؟۔ کیا آپ فرمائیں گے کہ نماز اور اذان۔ نکاح اور طلاق اور وراثت وغیرہ میں تمام امت ایک ہی طریقہ پر عمل کررہی ہے ؟۔ کیا خدا کی حفاظت اور ذمہ داری اسی کو کہتے ہیں ؟۔ کیا امت کے مختلف فرقے اپنے اپنے ہر دینی عمل کو رسول اللہ کی سُنت نہیں قرار دے رہے ؟ کیا

آپ نے یہ نہیں لکھا کہ "اس میں شک کی گنجائش موجود ہوتی ہے کہ جس قول یا فعل کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے منسوب کیا گیا ہو وہ واقعی حضور کا ہے یا نہیں؟" (اس میں قول کے علاوہ فعل کا بھی ذکر ہے)۔

(۲)۔ شاید آپ یہ کہہ دیں کہ یہ اختلافات جزئیات کے معمولی اختلافات ہیں، ان سے دین پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ میں پوچھنا

جزئیات کا اختلاف

یہ چاہتا ہوں کہ جن جزئیات کو (بقول آپ کے) خدا کی وحی نے متعین کیا ہو کیا ان میں ذرا سا اختلاف بھی معصیت کا موجب نہیں ہو جاتا۔ مثلاً، اللہ تعالیٰ نے قرآن میں مندرج وحی کے ذریعہ حکم دیا کہ وضو میں اپنے ہاتھ کہنیوں تک دھویا کرو۔ اگر کوئی شخص یا فرقہ اپنے ہاتھ صرف پنجوں تک دھوئے تو کیا آپ کے نزدیک یہ بھی اسی طرح حکم خداوندی کی تعمیل ہوگی جس طرح اس شخص یا فرقہ کا عمل جو کہنیوں تک ہاتھ دھوئے ارشاد باری تعالیٰ کی تکمیل کہلائے گا۔ سوچئے کہ اگر وحی کے ایک حصے میں جزئیات کا اتنا سا خفیف اختلاف بھی شریعت کی خلاف ورزی کہلا سکتا ہے تو وحی کے دوسرے حصے میں اتنے بڑے اختلافات (مثلاً ایک فرقہ جس جنسی تعلق کو عین مطابق شریعت رسول اللہ قرار دیتا ہے دوسرا فرقہ اُسے زنا سے تعبیر کرتا ہے) احکام خداوندی پر کچھ اثر انداز نہیں ہوں گے؟ یہ جزئیات ہی تو تھیں جن کے تعین کے لئے اس دوسری وحی کی ضرورت پڑی۔ اگر ان کا اختلاف کچھ ایسا وزن نہیں رکھتا تو پھر اس کے لئے اس وحی کی ضرورت کیا تھی۔

(۳)۔ آپ فرماتے ہیں کہ اگر سنّت کے متن میں اس قدر اختلافات ہیں تو قرآن کی تعبیر میں بھی تو بے شمار اختلافات

قرآن کی تعبیرات میں اختلاف

ہو سکتے ہیں۔ اور ہوئے ہیں۔ اگر قرآن کی تعبیر میں اختلاف اسے آئین کی بنیاد قرار دینے میں مانع نہیں تو سنّت کے متن کا اختلاف اس امر میں کیسے مانع ہو سکتا ہے؟ آپ کی یہ دلیل بعینہٖ اس طرح کی ہے جس طرح جب مرزائی حضرات سے کہا جائے کہ مرزا صاحب کے کردار میں فلاں نقص پایا جاتا ہے تو وہ کہہ دیا کرتے ہیں کہ (معاذ اللہ معاذ اللہ) رسول اللہ کی فلاں بات بھی ایسی نہیں تھی؟۔

بھی حضرت! متن اور اس کی تعبیرات دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ قرآن کریم کے متن میں کسی ایک حرف کے متعلق بھی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ باقی رہیں اس کی تعبیرات، سو وہ انسانی فعل ہے۔ جو کسی دوسرے کے لئے دین کی سند اور حجت نہیں ہو سکتا۔ اس کے برعکس احادیث کی تعبیرات میں نہیں، ان کے متن میں ہی اختلاف ہے۔ ایک فرقہ ایک حدیث کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول مانتا ہے تو دوسرا اُس کے قول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہونے سے یکسر انکار کر دیتا ہے۔

آپ نے اپنے آخری خط میں لکھا ہے کہ سُنتوں کے متعلق اس قسم کے اختلاف سے ایمان پر قطعاً کوئی آنچ نہیں آتی۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اگر کوئی شخص قرآن کریم کی کسی آیت کے متعلق بھی یہ کہہ دے کہ میں اسے خدا کا کلام نہیں مانتا، تو کیا اس سے اس کے ایمان پر کوئی آنچ آئے گی یا نہیں؟ اگر آنچ آئے گی تو پھر حدیث اور قرآن کو یکساں وحی قرار دینا کہاں تک صحیح قرار دیا جا سکتا ہے؟ کچھ سمجھا آپ نے کہ متن کے اختلاف اور تعبیرات کے اختلاف میں کتنا بڑا فرق ہے۔؟ لیکن آپ اسے کیا سمجھیں گے

جو قرآن کے متعلق کہہ رہے ہیں کہ "اگر احکام اخذ کرنے میں لوگوں کا اختلاف ہو تو الفاظ میں اتفاق سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے"۔

آپ کی اس نرالی منطق کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے (معاذ اللہ) قرآن کے الفاظ کو محفوظ رکھنے میں ناحق اتنا اہتمام فرمایا۔ جب لوگوں نے اس سے مختلف تعبیرات لے لینی تھیں تو پھر اس سے کیا فرق پڑتا کہ الفاظ محفوظ ہیں یا نہیں۔ جس شخص کا قرآن اور اس کی حفاظت کی غرض اور فائدہ کے متعلق یہ ایمان ہو، میں نہیں سمجھتا کہ اس سے کس سطح پر گفتگو کی جائے۔؟

یہ اختلاف کب شروع ہوا؟

قرآن کے متن سے احکام اخذ کرنے میں اختلاف اُس وقت پیدا ہوا جب دین ایک اجتماعی نظام کی جگہ انفرادی چیز بن گیا۔ جب تک دین کا اجتماعی نظام قائم رہا اُس وقت تک اس باب میں اُمت میں کوئی اختلاف پیدا نہیں ہوا۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ یا حضرت عمرؓ کے زمانے میں اُمت کے افراد قرآن کے کسی حکم پر مختلف طریقوں سے عمل پیرا تھے۔؟ جب پھر اس قسم کا نظام قائم ہو گا تو پھر تعبیرات کے یہ اختلافات باقی نہیں رہیں گے۔ یہ اسی صورت میں ممکن تھا کہ قرآن کے الفاظ محفوظ رہتے۔ اگر قرآن کے الفاظ محفوظ نہ ہوتے، اور مختلف فرقوں کے پاس احادیث کی طرح قرآن کے بھی الگ الگ مجموعے ہوتے تو امت میں وحدتِ عمل کا امکان ہی باقی نہ رہتا، تاوقتیکہ کوئی دوسرا رسول آکر وحی کے الفاظ کو محفوظ طور پر انسانوں تک نہ پہنچا دیتا۔

(۴) - میں نے کہا تھا کہ اگر اعمال و اقوالِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دین کا غیر متبدل جزو تھے جس کا اتباع ہر مسلمان کیلئے قیامت تک کے لئے واجب تھا، تو اُن احکام کو قرآن کی طرح مرتب کتاب کی شکل میں امت کو ملنا چاہیئے تھا۔ اس کا مذاق اڑاتے ہوئے آپ جس بازاریت پر اُتر آئے ہیں، اس کا تو میں کوئی جواب نہیں دے سکتا۔ البتہ آپ نے جو مثالوں کو اپنی دلیل بنایا ہے اُن کے متعلق ضرور کچھ عرض کروں گا۔

آپ فرماتے ہیں کہ اگر اس زمانے میں کوئی ایسا لیڈر ہو جو قوم کی زندگی کے مختلف شعبوں میں انقلاب پیدا کرنے کے لئے جدوجہد کرے تو کیا یہ ممکن ہے کہ اس کا ہر قول اور عمل کتابی شکل میں مدوّن ہو سکے؟

بندہ نواز! یاد رکھئے کہ ایک عام لیڈر میں اور ایک نبی میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ عام لیڈر کے اقوال و اعمال

حفاظتِ احادیث

اُس کے ہمعصروں یا آنے والوں کے لئے دینی حجت نہیں ہوتے۔ نہ کوئی اُن پر ایمان لانے کیلئے مکلّف ہوتا ہے۔ نہ وہ حق اور باطل کا ابدی معیار قرار پاتے ہیں۔ نہ اُن پر کسی کی نجات کا دار و مدار ہوتا ہے۔ نہ ان کی خلاف ورزی سے کفر لازم آتا ہے۔ اس کے اعمال و اقوال کا ریکارڈ محض اس کی ذاتی کوششوں کا مظہر ہوتا ہے۔ اس سے زیادہ ان کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ لہٰذا اگر وہ ریکارڈ نہ بھی مرتب ہوا یا اگر مرتب ہوا اور اس میں استقام یا اختلافات پائے جائیں تو اُس سے نہ کسی کا دین خراب ہوتا ہے، نہ عاقبت بگڑتی ہے۔ اس کے برعکس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال و اقوال کے متعلق آپ کا ارشاد یہ ہے کہ وہ وحی منزل من اللہ ہیں۔ دین کا ۹/۱۰ حصہ ہیں۔ تمام مسلمانوں کے لئے

قیامت تک واجب الاتباع ہیں۔ ان کی خلاف ورزی خدا کی معصیت ہے۔ جس کا نتیجہ جہنم کا عذاب ہے۔ فرمائیے کہ ایسی ہستیؐ کے اعمال و اقوال کے ریکارڈ اور ہمارے زمانے کے کسی لیڈر کے اعمال و اقوال کے ریکارڈ میں کوئی فرق ہے یا نہیں؟

آپ نے لکھا ہے کہ جب موجودہ زمانے کے ایسے وسیع اسباب و ذرائع کے باوجود کسی لیڈر کے اعمال و اقوال کا ریکارڈ مرتب کرنا ممکن نہیں تو حضورؐ کے اعمال و اقوال کا ریکارڈ مرتب کرنا کس طرح ممکن تھا۔؟ آپ نے سوچا بھی ہے کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ خدا اُن اُمور کو تمام نوعِ انسانی کے لئے قیامت تک کے لئے نجات کا مدار قرار دے رہا ہے۔ جن کا انسانوں تک مرتب اور محفوظ شکل میں پہنچانا ناممکنات میں سے تھا۔ اللہ آپ کی حالت پر رحم کرے۔

آپ کے کہنے کا غالباً مطلب یہ ہے کہ جن احکام کو عملاً کرکے دکھایا جائے وہ کتابی شکل میں مرتب نہیں ہو سکتے۔ آپ کا یہ خیال سرے سے غلط ہے۔ آج بازاروں میں نماز کی کتابیں عام ملتی ہیں۔ جن میں نماز کی تمام جزئیات الفاظ میں لکھی ہوئی درج ہوتی ہیں۔ اور ان سے ہر شخص نماز کی شکل کو متعین کر سکتا ہے۔ دنیا کی یہ بڑی بڑی عمارتیں۔ عظیم الشان پل پیچیدہ سے پیچیدہ مشینیں اُن کتابوں کی مدد سے ہر مقام پر تعمیر اور مرتب ہوتی ہیں جن میں ان کی تفاصیل درج ہوتی ہیں، بالآخر دین کے اعمال میں وہ کونسی مشکل تھی جس کی بنا پر وہ الفاظ میں بیان نہیں کئے جا سکتے تھے۔ اور اگر آپ کی ضد کے پیش نظر کوئی مان بھی لے کہ اعمال کو الفاظ میں ریکارڈ کرنا ممکن نہیں تھا تو آپ قولی حدیثوں کے متعلق کیا فرمائیں گے؟ کیا یہ بھی رسول اللہ کے لئے ناممکن تھا کہ وہ ان ارشادات کو اپنے الفاظ میں محفوظ کرکے امت کو دے جاتے جس رسول نے اپنی وحی کی ایک قسم کی کتابت کے لئے ایک چھوڑ چھبیس چھبیس کاتب مقرر فرمائے۔ جس نے اس وحی کے الفاظ کو سینکڑوں لوگوں کو حفظ یاد کرا دیا۔ کیا اس کے لئے یہ ناممکن تھا کہ اپنی وحی کے "دوسرے حصے" کو بھی اسی طرح محفوظ کر دیتا۔

(۵)۔ آپ فرماتے ہیں کہ "دیکھئے برطانیہ کا آئین تحریری شکل میں موجود نہیں، پھر بھی ان کا کام کیسے چل رہا ہے۔" بندہ پرور! آپ کو اس کا بھی علم ہے کہ برطانیہ کے آئین میں بنت نئے دن کتنی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ ان کے ہاں کی پارلیمانی اکثریت جو تبدیلی چاہے کر سکتی ہے۔ کیا دین کی بھی آپ کے نزدیک یہی حیثیت ہے؟ اگر دین کے آئین کے تحریری نہ ہونے سے کچھ فرق نہیں پڑتا تھا تو قرآن کریم کو کیوں تحریر میں لایا گیا، اور اس تحریر کی حفاظت کا ذمہ خدا نے کیوں لیا؟ کیا اللہ میاں کے علم میں (معاذ اللہ) برطانوی آئین کا تجربہ نہیں تھا؟

قانون سازی کا اصول

۱۲۔ آپ فرماتے ہیں کہ "سنن ثابتہ کے اختلاف کو برقرار رکھتے ہوئے (پاکستان میں صحیح اسلامی آئین کے مطابق) قانون سازی کا مسئلہ یہ ہے کہ ا۔

> شخصی قانون (پرسنل لاء) کی حد تک ہر ایک گروہ کے لئے احکام قرآنی کی وہی تعبیر اور سنن ثابتہ کا وہی مجموعہ معتبر ہو جسے وہ مانتا ہے۔ اور ملکی قانون (پبلک لاء) کی تعبیر قرآن اور ان سنن ثابتہ کے مطابق ہو جس پر اکثریت اتفاق کرے۔"

کیا میں یہ پوچھنے کی جسارت کرسکتا ہوں کہ ۔

(۱)۔ شخصی قانون اور ملکی قانون کا یہ فرق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا حضورؐ کے خلفائے راشدینؓ کے زمانے میں بھی تھا ۔ ؟

(۲)۔ کیا قرآنِ کریم سے اس تفریق کی کوئی سند مل سکتی ہے ۔ ؟

(۳)۔ کیا شخصی قانون اور ملکی قانون کی یہ تفریق اس زمانے کی پیداوار نہیں جس میں مذہب اور سیاست کی ثنویت پیدا ہوئی ۔ ؟

(۴)۔ کیا کوئی آئین یا قانون جو اس تفریق یا ثنویت کو برقرار رکھے کسی صورت میں بھی اسلامی کہلا سکتا ہے ؟

(۵)۔ کیا اسے خدا کی اطاعت اور رسول اللہؐ کی سنت کا اتباع قرار دیا جاسکتا ہے ؟

اب آئیے اس حل کی طرف کہ ملکی قانون اس تعبیرِ قرآن اور سنتِ ثابتہ کے مطابق ہو جس پر اکثریت اتفاق کرے ۔ اگر

اکثریت کی حیثیت

آپ بھول گئے ہوں تو میں آپ کو یاد دلادوں کہ اس اکثریت کے متعلق آپ کیا فرما چکے ہیں ۔ آپ کا ارشاد یہ تھا کہ :۔

> "یہ انبوہِ عظیم جس کو مسلمان قوم کہا جاتا ہے، اس کا حال یہ ہے کہ اس کے ۹۹۹ فی ہزار افراد نہ تو اسلام کا علم رکھتے ہیں، نہ حق اور باطل کی تمیز سے آشنا ہیں ۔ نہ ان کا اخلاقی نقطۂ نظر اور نہ ذہنی زاویہ اسلام کے مطابق تبدیل ہوا ہے ۔ باپ سے بیٹے اور بیٹے سے پوتے کو بس مسلمان کا نام ملتا چلا آرہا ہے ۔ اس لئے یہ مسلمان ہیں ۔ نہ انھوں نے حق کو حق جان کر اسے قبول کیا ہے، نہ باطل کو باطل جان کر اسے ترک کیا ہے ۔ ان کی کثرتِ رائے کے ہاتھ میں باگیں دیکر اگر کوئی شخص یہ امید رکھتا ہے کہ گاڑی اسلام کے راستے پر چلے گی تو اس کی خوش فہمی قابلِ داد ہے ۔"
>
> (سیاسی کشمکش حصہ سوم مطبوعہ ترجمان جلد ۱۰۔ عدد ۱ صفحہ ۱۱۰)

آپ فرمائیے کہ اسی اکثریت کی تعبیر اب اسلامی قانون کہلائے گی ۔ ؟ اُن افراد کی اکثریت جن کے متعلق آپ دوسرے موقعہ پر لکھ چکے ہیں کہ :۔

> "مسلم سوسائٹی ایک چڑیا گھر ہے ۔ جس میں چیل ۔ کوّے ۔ گدھ ۔ بٹیر ۔ تیتر اور ہزاروں قسم کے جانور جمع ہیں ۔ اور ان میں سے ہر ایک چڑیا گھر ہے ۔ کیونکہ چڑیا گھر میں داخل ہے ۔"
>
> (سیاسی کشمکش حصہ سوم صفحہ ۲۷)

معلوم نہیں آپ نے اس چڑیا گھر کے "اُلّوؤں" کا ذکر کیوں نہیں کیا ؟ ۔ ممکن ہے کہ آپ یہ فرمادیں کہ اس سے مراد وہ مسلمان نہیں جن کا مذہب سے تعلق ہے ۔ لیکن ان کے متعلق بھی آپ کی رائے یہ ہے کہ :۔

"جہاں مسلمانوں میں مذہب کے ساتھ ابھی دلچسپی باقی ہے، وہاں یہ شیاطین مذہب کا جامہ پہن کر آتے ہیں، اور دین کے نام پر ان مسائل پر بحثیں چھیڑتے ہیں اور نزاعیں برپا کراتے ہیں، کہ بسا اوقات سر پھٹول اور مقدمہ بازیوں تک نوبت پہنچا دیتے ہیں۔ جن کی دین میں کوئی اہمیت نہیں ہوتی"

(سیاسی کشمکش حصہ سوم مطبوعہ ترجمان جلد ۱۲ عدد ۱ صفحہ ۵۵)

اس سے ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے کہ اکثریت سے آپ کی مراد "صالحین" کی جماعت ہے، اور وہ بھی اُس وقت تک جب وہ آپ کی ہاں میں ہاں ملاتے رہیں۔ کیونکہ جو آپ سے مخالف اختلاف کرے وہ صالح ہی نہیں رہتا۔

۱۲۔ آپ نے سُنّت کے معلوم کرنے کے ذریعہ کے سلسلہ میں یہ بھی لکھا ہے کہ اس کا ثبوت وہ معاشرہ ہے جو اسلام کے

اسلامی معاشرہ کی حالت

آغاز میں پہلے دن قائم ہوا تھا۔ وہ اُس وقت سے آج تک مسلسل زندہ ہے۔ اور اس کی وجہ سے تمام دنیا کے مسلمانوں میں عقائد اور طرزِ فکر، اخلاق اور اقدار عبادات اور معاملات، نظریۂ حیات اور طریقِ حیات کے لحاظ سے گہری مماثلت پائی جاتی ہے۔

سب سے پہلے تو یہ دیکھیے کہ جس معاشرہ کے وجود کو آپ سُنّتِ رسول اللہ کی دلیل کے طور پر پیش کر رہے ہیں اُس کے متعلق آپ ہمیں پہلے بتا چکے ہیں کہ:۔

"حضرت عثمانؓ کے زمانہ ہی سے اس پر جاہلیت نے حملہ شروع کر دیا تھا۔ تھوڑے ہی عرصہ بعد خلافت علیٰ منہاج نبوت کا دور ختم ہو گیا، اور حکومت کی اساس اسلام کی بجائے پھر جاہلیت پر قائم ہو گئی"

اس کے بعد آپ نے لکھا ہے کہ:۔

"جاہلیت کے مرض نے سرطان کی طرح اجتماعی زندگی میں اپنے ریشے بتدریج پھیلانے شروع کر دیئے اور سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ یہ جاہلیت بے نقاب ہو کر سامنے نہ آئی تھی بلکہ مسلمان بن کر آئی تھی۔ آگے آگے توحید کا اقرار، صوم و صلوٰۃ پر عمل، قرآن و حدیث سے استشہاد تھا، اور اس کے پیچھے پیچھے جاہلیت اپنا کام کر رہی تھی۔ چنانچہ سیاست، تعلیم، طریقت پر آہستہ آہستہ جاہلیت چھا گئی، اور اس کے اثرات روز بروز پھیلتے چلے گئے۔ اور عقائد کی موشگافیوں نے نئے نئے فرقے پیدا کر دیئے۔ ایک صریح بت پرستی تو نہ ہو سکی، باقی کوئی قسم شرک کی ایسی نہ رہی جس نے مسلمانوں میں رواج نہ پایا ہو۔ بہانی جاہلی قوموں کے جو لوگ اسلام میں داخل ہوئے تھے وہ اپنے ساتھ بہت سے مشرکانہ تصورات لئے چلے آئے، اور انھوں نے پرانے معبودوں کی جگہ بزرگانِ اسلام میں سے کچھ معبود تلاش کر لئے تھے۔ حتیٰ کہ انھوں نے ایک نئی شریعت ایجاد کر لی"

(تجدید و احیائے دین۔ صفحہ ۲۸۳ و صفحہ ۲۸۵)

کیا یہی وہ معاشرہ جس کے وجود کو آپ سُنّتِ رسول اللہ کے لئے بطور ثبوت پیش کر رہے ہیں۔؟ اس معاشرہ کو آپ

"چڑیا گھر" سے تشبیہ دے چکے ہیں، اور اسی چڑیا گھر کو آپ اب سنّتِ رسول اللہ کی تثلیث کے طور پر بطور دلیل پیش کر رہے ہیں۔ قلم ہاتھ میں لیتے وقت انسان کو کچھ سوچنا بھی چاہیے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں اور اس سے پیشتر کیا لکھ چکا ہوں۔ دین کو جنلزم کی سطح سے کچھ تو اونچا رکھنا چاہیے۔

حضورؐ کو امیر کس نے مقرر کیا تھا؟

۱۴۔ آپ نے ترجمان اکتوبر اور نومبر ۱۹۶۱ء کے متعدد اوراق اس بحث میں ضائع کر دیئے کہ حضورؐ کو اسلامی ریاست کا صدر یا مسلمانوں کا لیڈر یا قاضی اور جج کس نے بنایا تھا۔ خدا نے یا مسلمانوں نے انتخاب کے ذریعے؟ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس بحث سے بالآخر آپکا مقصد کیا تھا؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآنِ کریم کی ہدایات کے مطابق ایک اسلامی مملکت قائم کی۔ ایک بچہ بھی اس بات کو سمجھ لے گا کہ اس مملکت کا اوّلین سربراہ اور مسلمانوں کا رہنما، اور تمام معاملات کے فیصلے کرنے کی آخری اتھارٹی جس کے فیصلوں کی کہیں اپیل نہ ہو سکے، رسول اللہ کے سوا اور کون ہو سکتا تھا؟

اطاعتِ رسولؐ پر زور

ممکن ہے آپ یہ کہہ دیں کہ اگر یہ سب کچھ رسول اللہ نے ہی ہونا تھا تو قرآن کریم نے ان امور میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت پر اتنا زور کیوں دیا؟ اس کی وجہ یہ تھی کہ نزولِ قرآن کے وقت دنیا میں مذہب اور سیاست دو الگ الگ شعبے بن گئے تھے۔ مذہبی امور میں مذہبی پیشواؤں کی اطاعت ہوتی تھی، اور سیاسی یا دنیاوی امور میں حکومت کی۔ قرآن نے اس ثنویت کو مٹایا اور مسلمانوں سے کہا کہ رسول اللہ تمہارے مذہبی رہنما ہی نہیں۔ سیاسی و تمدنی امور میں تمہارے سربراہ بھی ہیں۔ اس لئے ان تمام امور میں بھی آپ ہی کی اطاعت کی جائے گی۔ رسول اللہ کے بعد یہ تمام مناصب (یعنی خدا سے وحی پانے کے علاوہ دیگر مناصب) حضورؐ کے سچے جانشین (خلیفۃ الرسولؐ) کی طرف منتقل ہو گئے۔ اور اب "خدا اور رسول کی اطاعت" کے معنی اس نظام کی اطاعت ہو گئے جسے عام طور پر "خلافت علیٰ منہاجِ نبوّت" کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اسی کو میں نے "مرکزِ ملّت" کی اصطلاح سے تعبیر کیا تھا جس کا آپ مذاق اڑا رہے ہیں۔ مرکزِ ملّت سے میری مراد ہے حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ اور انہیں کی مثل اسلامی نظام کے دیگر سربراہ، خواہ وہ پہلے گزر چکے ہوں یا آئندہ آنے والے ہوں۔ اب آپ نے کچھ سمجھا کہ آپ کے طنز اور استہزاء کے نشتر کہاں تک پہنچتے ہیں۔؟

خدا اور رسولؐ سے مراد

یہ جو میں نے کہا کہ "خدا اور رسولؐ" سے مراد اسلامی نظام ہے، تو یہ میری اختراع نہیں۔ اس کے مجرم آپ بھی ہیں۔ آپ نے اپنی تفسیر تفہیم القرآن میں سورۂ مائدہ کی آیت إِنَّمَا جَزَٰٓؤُا۟ ٱلَّذِينَ يُحَارِبُونَ ٱللَّهَ وَرَسُولَهُۥ (۵:۳۳) کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے:-

"خدا اور رسول سے لڑنے کا مطلب اس نظامِ صالح کے خلاف جنگ کرنا ہے، جو اسلام کی حکومت نے ملک میں قائم کر رکھا ہے .... ایسا نظام جب کسی سرزمین میں قائم ہو جاتا ہے

تو اس کو خراب کرنے کی سعی کرنا در اصل "خدا اور اس کے رسولؐ" کے خلاف جنگ ہے۔"

(جلد اوّل۔ صفحہ ۴۶۵)

ذرا سوچئے کہ اگر ہمیں "خدا اور رسولؐ" سے مراد اسلامی حکومت لوں تو ہدفِ طعن و تشنیع بن جاؤں، اور اس سے آپ ہی مراد لیں تو مفسرِ قرآن کہلائیں۔

میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا حضرت ابوبکر صدیقؓ کے فیصلوں کی اطاعت اُمت کے لئے "خدا اور رسولؐ" کی اطاعت کے مرادف تھی یا نہیں؟

حضورؐ بحیثیتِ صدرِ مملکت

۱۵۔ آپ نے لکھا ہے کہ حضورؐ کو جو خدا نے صدرِ ریاست یا جج مقرر کیا تھا تو اس کے معنی یہ تھے کہ آپ کا ہر فیصلہ وحیِ الٰہی پر مبنی ہوتا تھا۔ لیکن مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ آپ کا یہ دعویٰ خود آپ کے بیانات کے خلاف جاتا ہے۔ سب سے پہلے تو یہ کہ صدرِ ریاست کی حیثیت سے آپؐ کو صحابہؓ سے مشورہ کرنے کا حکم خود خدا نے دیا تھا۔ اس ضمن میں آپ نے تحریر فرمایا ہے:۔

"اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بحیثیت صدرِ ریاست کے خطاب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے کہ وَ شَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ۔ یہ دونوں آیتیں مشورے کو لازم کرتی ہیں۔ اور صدرِ ریاست کو ہدایت کرتی ہیں کہ جب وہ مشورے کے بعد کسی فیصلے پر پہنچ جائے تو اللہ کے بھروسے پر اُسے نافذ کرے۔" (ترجمان القرآن دسمبر ۱۹۵۲ء صفحہ ۲)۔

سوال یہ ہے کہ اگر بحیثیت صدرِ ریاست رسول اللہؐ کا ہر حکم وحی پر مبنی ہوتا تھا تو پھر آپ کو مشورہ کا حکم کیوں دیا گیا تھا۔؟ آپ نے زیرِ نظر خط و کتابت میں اس سلسلہ میں یہ لکھا ہے کہ "حضورؐ نے مشاورت صرف تدابیر کے معاملہ میں کی ہے"۔ آپ اس سے پہلے لکھ چکے ہیں کہ حضورؐ نے اپنی تیئس ۲۳ سالہ نبوت کی زندگی میں جو کچھ کہا یا کیا وہ سب وحی کی بنا پر تھا! اور اب آپ "تدابیر" کو اس سے خارج کر رہے ہیں۔

آپ نے لکھا ہے:۔

"کیا آپ کوئی ایسی مثال پیش کر سکتے ہیں کہ عہدِ رسالت میں قرآن کے کسی حکم کی تعبیر مشورے سے کی گئی ہو، یا کوئی قانون مشورہ سے بنایا گیا ہو۔؟ بہت سی نہیں، صرف ایک مثال ہی آپ پیش فرمائیں"

اوّل تو مجھے مثال پیش کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے اس لئے کہ خدا نے حضورؐ کو مشورے کا حکم دیا تھا۔ اور میرا ایمان ہے کہ حضورؐ نے اس حکم کی یقیناً تعمیل فرمائی ہوگی۔ اب رہا یہ سوال کہ آپؐ نے کونسے معاملات میں مشورہ کیا۔؟ تو قرآن نے اس میں کوئی تفریق نہیں کی۔ اس لئے قرآن کے اصولی احکام کی تفاصیل کے تعین میں حضورؐ نے مشورہ کیا ہوگا۔ اسکی ایک مثال تو ہمیں مشکوٰۃ شریف میں ملتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں نماز کے لئے آواز دینے کا حکم دیا۔ لیکن اس دعوت کے طریق

اذان کیسے مقرر ہوئی تھی؟

کو متعین نہیں کیا۔ اس کا تعین حضورؐ نے صحابہؓ کے مشورہ سے کیا اور اپنی رائے کے خلاف کیا۔ کیونکہ آپ نے پہلے ناقوس بجانے کا حکم دیا تھا۔ فرمائیے کہ اذان دین کے احکام میں داخل ہے یا نہیں۔؟

۱۶۔ اب رہے حضورؐ کے فیصلے بحیثیت جج کے۔ تو آپ کے دعوے کے مطابق حضورؐ کا ہر فیصلہ وحی پر مبنی ہونا چاہیئے لیکن آپ کو خود اس کا اعتراف ہے کہ آپ کے یہ فیصلے وحی پر مبنی نہیں ہوتے تھے۔ چنانچہ آپ نے تفہیم القرآن جلد اول صفحہ ۱۴۹ پہ یہ حدیث نقل کی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا:۔

"میں بہرحال ایک انسان ہی تو ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ تم ایک مقدمہ میرے پاس لاؤ۔ اگر تم میں سے ایک فریق دوسرے کی نسبت زیادہ چرب زبان ہو اور اُس کے دلائل سُن کر میں اُس کے حق میں فیصلہ کر دوں۔ مگر یہ سمجھ لو کہ اگر اس طرح اپنے کسی بھائی کے حق میں سے کوئی چیز تم نے میرے فیصلے کے ذریعے سے حاصل کی تو درحقیقت تم دوزخ کا ایک ٹکڑا حاصل کرو گے۔"

حضورؐ کے فیصلوں کی یہی امکانی غلطیاں تھیں جن کے متعلق قرآن کریم نے حضورؐ کی زبانِ مبارک سے کہلوایا تھا کہ "اگر میں غلطی کرتا ہوں تو وہ میری اپنی وجہ سے ہوتی ہے۔ اگر میں سیدھے راستے پر ہوں تو وہ وحی کی بنا پر ہوتا ہے۔" آپ نے محض اپنی بات بنانے کے لئے اس آیت کو جس طرح مسخ کیا ہے اس پر علم روتا ہے اور عقل ہنستی ہے۔

قرآن کی تادیب

۱۷۔ میں نے یہ پوچھا تھا کہ اگر حضورؐ کا ہر فیصلہ بربنائے وحی ہوتا تھا تو آپ کی جن لغزشوں پر قرآن میں تادیب آئی ہے وہ لغزشیں کیوں سرزد ہوئی تھیں۔؟ آپ اس کے جواب میں فرماتے ہیں:۔

"حضورؐ سے اپنی پوری پیغمبرانہ زندگی میں صرف وہی چند لغزشیں ہوئی تھیں جن کی اللہ تعالیٰ نے فوراً اصلاح فرما دی۔"

آپ بار بار اسے دہراتے ہیں کہ حضورؐ نے نبوت پانے کے بعد اپنی زندگی کے آخری سانس تک جو کچھ کیا وہ خدا کی طرف سے وحی تھا۔ اور یہ آغازِ اسلام سے آج تک مسلمانوں کا متفقہ عقیدہ ہے۔

آپ یہ بھی فرماتے ہیں کہ حضورؐ سے صرف چند لغزشیں ہوئی تھیں۔ یعنی آپ کا خیال یہ ہے کہ اگر حضورؐ سے زیادہ لغزشیں ہوتیں تو یہ بات قابلِ اعتراض ہوتی۔ لیکن چند لغزشیں قابلِ اعتراض نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اگر حقیقت یہ تھی کہ حضورؐ کی ہر بات وحی پر مبنی ہوتی تھی تو حضورؐ کی ایک لغزش بھی دین کے سارے نظام کو درہم برہم کرنے کے لئے کافی تھی۔ اس لئے کہ وہ غلطی کسی انسان کی غلطی نہیں تھی، بلکہ (معاذاللہ) وحی کی غلطی تھی۔ خود خدا کی غلطی تھی۔ اور اگر (معاذاللہ) خدا بھی غلطی کر سکتا ہے تو ایسے خدا پر ایمان کے کیا معنی ہو سکتے ہیں۔؟ اللہ آپ لوگوں کے فتنہ سے اپنے دین کو محفوظ رکھے کہ جنہیں اپنی امارت کے نشے میں اس کا بھی

ہوش نہیں رہتا کہ ان کی بد مستیوں سے کس کس کی پگڑی اچھلتی ہے۔

دجّال کے متعلق احادیث

۱۸۔ آپ فرماتے ہیں کہ حضورؐ نے اپنی نبوت کی پوری زندگی میں جو کچھ کیا یا فرمایا وہ وحی کی بناء پر تھا۔ لیکن دجّال سے متعلق احادیث کے سلسلہ میں آپ کا ارشاد ہے کہ:-

"ان امور کے متعلق جو مختلف باتیں حضورؐ سے احادیث میں منقول ہیں وہ دراصل آپؐ کے قیاسات ہیں جن کے بارے میں آپؐ خود شک میں تھے" (رسائل و مسائل صفحہ ۵۵)

اور اس کے بعد آپ خود ہی اس کا اعتراف کر لیتے ہیں کہ:-

"حضورؐ کا یہ تردد تو خود ظاہر کرتا ہے کہ یہ باتیں آپ نے علمِ وحی کی بناء پر نہیں فرمائی تھیں، بلکہ اپنے گمان کی بناء پر فرمائی تھیں" (ایضاً صفحہ ۵۶)

۱۹۔ میں نے لکھا تھا کہ کئی ایسے فیصلے تھے جو رسول اللہ کے زمانے میں ہوئے، لیکن حضورؐ کے بعد جب تغیرِ حالات کا تقاضا ہوا تو خلفائے راشدینؓ نے ان فیصلوں کو بدل دیا۔ آپ نے فرمایا ہے کہ "یہ ان بزرگوں پر سخت بہتان ہے، جس کے ثبوت میں آپ نہ ان کا کوئی قول پیش کر سکتے ہیں نہ عمل"۔ آپ کو یہ معلوم کر کے تعجب ہوگا کہ اس باب میں خود آپ نے ایک ہی صفحہ آگے چل کر اس امر کا بیّن ثبوت پیش کر دیا ہے کہ صحابۂ کبارؓ حضورؐ کے فیصلوں کو تغیرِ حالات کے مطابق قابلِ ترمیم سمجھتے تھے۔ سُنیئے کہ آپ نے کیا لکھا ہے:-

"کس کو معلوم نہیں کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضورؐ کی وفات کے بعد جیشِ اسامہؓ کو بھیجنے پر صرف اس لئے اصرار کیا کہ جس کام کا فیصلہ حضورؐ اپنی زندگی میں کر چکے تھے اُسے بدل دینے کا وہ اپنے آپ کو مجاز نہ سمجھتے تھے۔ صحابۂ کرام نے جب ان خطرات کی طرف توجہ دلائی جن کا طوفان عرب میں اٹھتا ہوا نظر آ رہا تھا اور اس حالت میں شام کی طرف فوج بھیج دینے کو نامناسب قرار دیا، تو حضرت ابوبکرؓ کا جواب یہ تھا کہ اگر کتّے اور بھیڑیئے بھی مجھے اُچک کر لے جائیں تو میں اس فیصلے کو نہ بدلوں گا جو رسول اللہ نے کر دیا تھا"

(ترجمان، نومبر ۱۹۵۵ء صفحہ ۱۱۲)

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کے سوا باقی تمام صحابہؓ اس بات کو جائز سمجھتے تھے کہ حالات کے تغیر کے ساتھ رسول اللہ کے فیصلے کو بدلا جا سکتا ہے۔

پھر آپ نے لکھا ہے:-

"حضرت عمرؓ نے خواہش ظاہر کی کہ کم از کم اسامہؓ کو ہی اس لشکر کی قیادت سے ہٹا دیں کیونکہ بڑے بڑے صحابہؓ اس نوجوان لڑکے کی ماتحتی میں رہنے سے خوش نہیں ہیں۔ تو حضرت ابوبکرؓ نے ان کی ڈاڑھی پکڑ کر فرمایا کہ خطاب کے بیٹے! میری ماں تجھے روئے اور تجھے کھو دے! رسول اللہ نے اس کو مقرر کیا، اور تو

کہتا ہے کہ میں اُسے بتا دوں ؟　　(ترجمان۔ نومبر ۱۹۵۹ء)

اس سے بھی ثابت ہے کہ حضرت عمرؓ اس کے قائل تھے کہ تغیرِ حالات سے حضورؐ کے فیصلے بدلے جا سکتے ہیں۔ بلکہ اس واقع میں تغیرِ حالات کا بھی سوال نہیں تھا۔ حضرت عمرؓ اسے اس لئے بدلنا چاہتے تھے کہ اس سے صحابہؓ خوش نہیں تھے۔ آپ کا کیا خیال ہے ؟ کہ (حضرت ابوبکرؓ کے سوا) صحابہؓ میں سے کوئی بھی اس بات کو نہیں سمجھتا تھا کہ رسول اللہ کے فیصلے کسی حالت میں بھی بدلے نہیں جا سکتے ۔ ؟

۲۰۔ آپ فرماتے ہیں کہ میں کوئی مثال پیش کروں کہ رسول اللہؐ کے زمانے کے کسی فیصلے کو خلفائے راشدین نے بدلا ہو؟

فیصلوں میں تبدیلی

مجھے یاد پڑتا ہے کہ آپ نے اپنے ایک مضمون میں خود اس قسم کی مثالیں پیش کی تھیں، لیکن چونکہ اس وقت وہ مضمون میرے سامنے نہیں اس لئے میں اسے شہادت میں پیش کرنا نہیں چاہتا لیکن حسبِ ذیل واقعات سے تو آپ بھی انکار نہیں کریں گے:۔

(۱)۔ نبی اکرمؐ کے زمانے میں ایک مجلس میں دی ہوئی تین طلاقوں کو ایک شمار کر کے طلاقِ رجعی قرار دیا جاتا تھا۔ حضرت عمرؓ نے اپنے زمانے میں اسے تین شمار کر کے طلاقِ مغلظ قرار دے دیا، اور فقہ کی رُو سے اُمت آج تک اس پر عمل کر رہی ہے۔

(۲)۔ حضورؐ کے زمانے میں مؤلفۃ القلوب کو صدقات کی مد سے امداد دی جاتی تھی۔ حضرت عمرؓ نے اپنے زمانے میں اسے ختم کر دیا۔

(۳)۔ نبی اکرمؐ کے زمانے میں مفتوحہ زمینیں مجاہدین میں تقسیم کر دی گئی تھیں، لیکن حضرت عمرؓ نے اپنے زمانے میں اس سسٹم کو ختم کر دیا۔

(۴)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کے وظائف مساوی مقرر فرمائے تھے، لیکن حضرت عمرؓ نے انہیں خدمات کی نسبت سے بدل دیا۔

یا اس قسم کی کتنی ہی اور مثالیں ملتی ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ رسول اکرمؐ کے فیصلے تغیرِ حالات کے مطابق خلافتِ راشدہ میں بدلے گئے تھے۔

۲۱۔ مؤلفۃ القلوب کی امداد بند کر دینے کے سلسلہ میں ایک اور بات بھی قابلِ ذکر ہے۔ آپ نے میری اس بات کا

عبوری دَور کے احکام

بھی مذاق اڑایا ہے کہ قرآن کے جو احکام بعض شرائط سے مشروط ہوں، جب وہ شرائط باقی نہ رہیں تو وہ احکام اس وقت تک ملتوی ہو جاتے ہیں جب تک پھر ویسے ہی حالات پیدا نہ ہو جائیں۔ انہیں "عبوری دَور" کے احکام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

صدقات کی مد سے مؤلفۃ القلوب کو امداد دینے کا حکم قرآن کریم میں موجود ہے۔ حضرت عمرؓ اس مد کو یہ کہہ کر ختم کر دیتے ہیں کہ یہ حکم اس عبوری دَور تک تھا جب تک نظام کو اس قسم کی تالیفِ قلوب کی ضرورت تھی۔ اب وہ ضرورت باقی نہیں رہی، اس لئے

اس حکم پر عمل کرنے کی بھی ضرورت نہیں رہی۔ یہی منشاء ہوتا ہے اُن لوگوں کا جو قرآن کے اس قسم کے احکام کو "عبوری دور کے احکام" کہتے ہیں۔ اگر کوئی بات سمجھ میں نہ آئے تو اُسے سمجھ لینے میں کوئی عار نہیں ہونی چاہیئے۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ آپ کی انانیت آپ کو اس طرف آنے نہیں دیتی۔

اور اس لئے تو آپ خود بھی قائل ہیں کہ شریعت کا ایک حتمی فیصلہ بھی حالات کے سازگار ہونے تک ملتوی رکھا جا سکتا ہے۔ مثلاً آئین پاکستان کے سلسلہ میں آپ نے کہا تھا کہ ایک اسلامی ریاست کے نظم کو چلانے میں غیر مسلموں کی شرکت شرعاً اور عقلاً دونوں طور پر صحیح نہیں، لیکن :-

"سردست عارضی بندوبست کی حیثیت سے ہم اس کو جائز اور مناسب سمجھتے ہیں کہ ان کو ملک کی پارلیمنٹ میں نمائندگی دیجائے"۔

(ترجمان القرآن ستمبر ۱۹۵۲ء صفحہ ۴۲ و صفحہ ۴۳۱)

کیا سُنّت قرآن پر اضافہ کرسکتی ہے؟

۲۴- ایک سوال یہ بھی سامنے آیا تھا کہ سُنّت قرآنی احکام و اصول کی تشریح ہے یا وہ قرآنی احکام کی فہرست میں اضافہ بھی کرتی ہے۔؟

آپ نے جولائی کے ترجمان میں لکھا ہے :-

"مثلاً قرآن اقامت صلوٰۃ کا حکم دے کر رہجاتا ہے، یہ بات قرآن نہیں بتاتا بلکہ سُنّت بتاتی ہے کہ صلوٰۃ سے کیا مراد ہے، اور اس کی اقامت کا مطلب کیا ہے؟ اس غرض کے لئے سُنّت ہی نے مساجد کی تعمیر، پنجوقتہ اذان، نمازِ باجماعت کے اوقات، نماز کی ہیئت، اُس کی رکعتیں اور جمعہ و عیدین اور ان کی عملی صورت اور دوسری بہت سی تفصیلات ہم کو بتائی ہیں۔ (صفحہ ۲۲۲)

اس سے واضح ہے کہ قرآن نے جن باتوں کا اصولی طور پر حکم دیا، سُنّت نے اُن کی جزئیات متعین کر دیں۔ یہ نہیں کہ کچھ احکام قرآن نے دیئے اور اس فہرست میں سُنّت نے اس قسم کے مزید احکام کا اضافہ کر دیا۔ اگر ایسی صورت ہوتی تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ قرآن نے اپنے احکام کی جو فہرست دی وہ نا تمام تھی، سُنّت نے مزید اضافہ سے اس فہرست کی تکمیل کر دی۔ لیکن آپ نے جہاں ایک جگہ پہلی صورت بیان کی ہے، دوسرے مقام پر دوسری شکل بھی بیان کر دی ہے۔ حالانکہ یہ دونوں باتیں ایک دوسرے سے متضاد ہیں۔ (اور یہ چیز کوئی نئی نہیں۔ آپ شروع سے یہی کچھ کرتے چلے آرہے ہیں)، مثلاً آپ لکھتے ہیں :-

"قرآن میں اللہ تعالیٰ نے بیک وقت دو بہنوں کو نکاح میں جمع کرنے سے منع فرمایا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ پھوپھی بھتیجی اور خالہ بھانجی کو جمع کرنا بھی اس حکم میں داخل ہے"۔

(ترجمان القرآن۔ اکتوبر ۱۹۵۸ء صفحہ ۹۴)

آپ تھوڑی سی سوجھ بوجھ رکھنے والے انسان سے بھی پوچھیئے کہ (بقول آپ کے) رسول اللہؐ کا یہ ارشاد کہ پھوپھی بھتیجی اور خالہ بھانجی کو جمع کرنا بھی حرام ہے، قرآن کے حکم (یعنی دو بہنوں کو جمع کرنا حرام ہے) کی توضیح و تشریح ہے یا محرمات کی قرآنی فہرست میں

اضافہ ہے۔ ہر سمجھدار شخص (بشرطیکہ وہ آپ کی طرح ضدی نہ ہو، یا تجاہلِ عارفانہ نہ کرتا ہو) یہ کہدیگا کہ یہ فہرست میں اضافہ ہے۔ اس سے یہ اہم سوال سامنے آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جہاں قرآنی فہرست میں بھتیجیوں، خالاؤں، بھانجیوں، رضاعی ماؤں اور بہنوں، بیویوں کی ماؤں اور بیٹیوں کی بیویوں، حتیٰ کہ پالی ہوئی لڑکیوں تک کا ذکر کر دیا، اور یہ بھی کہہ دیا کہ دو بہنوں کو اکٹھا نہیں کرنا چاہیئے۔ وہاں کیا اللہ میاں کو (معاذ اللہ) یہ کہنا نہیں آتا تھا کہ پھوپھی بھتیجی اور خالہ بھانجی کو بھی اکٹھا نہیں کیا جا سکتا۔ یا کیا (معاذ اللہ) اللہ تعالیٰ سے اس باب میں سہو ہو گیا تھا، اور یہ بات لکھنے سے رہ گئی تھی جو اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تلافی فرما دی، اور یوں خدا کی مرتب کردہ فہرست مکمل ہو گئی۔

آپ لوگوں کی بلا سے کہ اس قسم کے خیالات سے خدا، اس کی کتاب اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کیا تصور پیدا ہوتا ہے۔

آپ کہہ دیں گے کہ یہ اضافہ رسول اللہؐ نے اپنی طرف سے نہیں فرمایا بلکہ خدا کی طرف سے نازل کردہ وحی کی بنا پر فرمایا تھا۔ لیکن اس سے وہ سوال تو اپنی جگہ پر رہتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں محرمات کی فہرست دے رہا تھا تو کیا اُس وقت (معاذ اللہ) اُس کے سامنے یہ بات نہیں تھی جو بعد میں اس کا اضافہ کیا۔ ؟ اور پھر وہ بھی اُس وحی کے ذریعہ جو قرآن میں داخل نہ ہوئی۔ کیا قرآن کریم میں کہیں بھی یہ آیا ہے کہ اس میں بیان کردہ فہرستیں نا تمام ہیں، اور ان کی تکمیل خدا نے ایک اور وحی سے کی ہے جو قرآن میں درج نہیں ہوئی۔ ؟ (اور نہ جسے اُس کے رسولؐ نے کسی اور کتاب میں درج کیا ہے) اور اُسے ڈھائی سو سال بعد بخارا کے ایک امامؒ اپنے مجموعے میں درج کریں گے اور اس مجموعے کے متعلق چودہ سو سال بعد سلسلۂ مودودیہ چشتیہ کے ایک صحافی یہ فتویٰ دیں گے کہ اس کی ہر حدیث اس قابل نہیں کہ اسے جُوں کا تُوں مان لیا جائے۔ خدا کے بندو! کچھ تو اللہ میاں سے شرم کرو کہ تم اس کے آخری دین کو یوں اچھوکہ بنا رہے ہو!!

۲۳- میں نے یہ بھی پوچھا تھا کہ کیا سُنّت قرآن کے کسی حکم کو منسوخ کر سکتی ہے ؟۔ اس کے جواب میں آپ نے جس طرح فقہی اصطلاحات کی آڑ میں ہاں یا نہ کرنے سے گریز کیا ہے وہ بھی آپ کا ایک مخصوص حصّہ ہے۔ بات یہ نہیں تھی کہ

کیا سُنّت قرآن کو منسُوخ کرسکتی ہے؟

آپ منسوخ کے معنی نہیں سمجھتے تھے۔ آپ نے خود اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ قرآن کی فلاں آیت نے اس کی فلاں آیت کو منسُوخ کر دیا۔ نہ ہی میں نے آپ سے یہ پوچھا تھا کہ تمہارے نسخ سے کیا مراد لیتے ہیں۔ ؟ سوال صاف تھا، لیکن اس کا جواب دینے میں آپ کو بڑی دشواری پیش آتی تھی۔ (اور یہ دشواری آپ کو قدم قدم پر پیش آتی رہتی ہے) اگر آپ یہ کہتے کہ حدیث قرآن کو منسُوخ نہیں کرتی تو آپ کو خطرہ تھا کہ اس سے وہ تمام حلقے ناراض ہو جائیں گے جو حدیث کو قرآن کا ناسخ جانتے ہیں۔ اور اگر یہ کہتے کہ حدیث قرآن کو منسُوخ کر سکتی ہے تو اس سے وہ طبقہ ناراض ہو جاتا جو یہ سمجھتا ہے کہ قرآن کو کوئی چیز منسُوخ نہیں کر سکتی۔ اس لئے دونوں طبقوں کو مطمئن رکھنے کا طریق یہ تھا کہ بات کو الجھا دیا جائے۔ جب اتنے سے ہتھکنڈے سے بات ٹل سکتی ہو تو کوئی کیوں دقت اُٹھائے۔

بھی اپنے گاہکوں کو خواہ مخواہ ناراض نہیں کیا کرتا۔

وحی کی قسمیں

۲۴۔ اب آتی ہے وہ آخری بات جس کے متعلق میں نے کہا تھا کہ ساری بحث کا مدار اس پر ہے اور وہ یہ کہ کیا رسول اللہ پر جو وحی نازل ہوتی تھی وہ ساری کی ساری قرآن مجید میں درج ہو گئی ہے یا قرآن میں صرف وحی کا ایک حصّہ داخل ہوا ہے اور دوسرا حصّہ درج نہیں ہوا۔ آپ کا جواب یہ ہے کہ وحی کی دو (بلکہ کئی) قسمیں تھیں۔ ان میں سے صرف ایک قسم کی وحی قرآن میں درج ہوئی ہے۔ باقی اقسام کی وحییں قرآن میں درج نہیں ہوئیں۔ لیکن اُن پر اُسی طرح ایمان لانا ضروری ہے جس طرح قرآن پر۔ اگرچہ اس کا فیصلہ ایک مزاج شناس نبوت کی جوہر شناس نگاہ کر سکے گی کہ وہ وحی کہاں ہے۔

مجھے اس کا اندازہ تو پہلے ہی ہو گیا تھا کہ آپ قرآن کریم سے کس طرح نابلد ہیں۔ لیکن اس سوال کے جواب میں آپ نے جس طرح قرآن کا "جھٹکا" کیا ہے، اُس سے آپ کی "جرأت" ضرور قابلِ داد نظر آتی ہے۔ قبل اس کے کہ میں قرآن کریم کے ان مقامات کی طرف آؤں، آپ کو یہ یاد دلا دینا چاہتا ہوں کہ آپ نے تفہیمات جلد اوّل میں یہ لکھا ہے:۔

> "اس میں شک نہیں کہ اصُولی قانون قرآن ہی ہے۔ مگر یہ قانون ہمارے پاس بلاواسطہ نہیں بھیجا گیا، بلکہ رسولِ خدا کے واسطے سے بھیجا گیا ہے۔ اور رسول کو درمیانی واسطہ اس لئے بنایا گیا ہے کہ وہ اصولی قانون کو اپنی اور اپنی امت کی عملی زندگی میں نافذ کر کے ایک نمونہ پیش کر دے، اور اپنی خداداد بصیرت سے ہمارے لئے وہ طریقے متعین کر دے جن کے مطابق ہمیں اس اصولی قانون کو اپنی اجتماعی زندگی اور انفرادی برتاؤ میں نافذ کرنا چاہیئے۔" (صفحہ ۳۰۹)

وحی کی خصوصیت ہی یہ ہے، اور اس خصوصیت کی بنا پر وہ مُنَزَّلْ مِنَ اللہ کہلاتی ہے، کہ اس میں اس فرد کی بصیرت کو کوئی دخل نہیں ہوتا جس پر وہ وحی بھیجی جاتی ہے۔ جس "وحی" کی رُو سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کے اصُولی قانون کے عملی طریقے متعین فرمائے تھے اگر وہ واقعی وحی مُنَزَّلْ مِنَ اللہ تھی، تو اس میں حضورؐ کی بصیرت کو کوئی دخل نہیں ہو سکتا تھا۔ اور اگر انہیں حضورؐ نے اپنی بصیرت سے تجویز فرمایا تھا تو وہ وحی نہیں تھی۔ رسول کی اپنی بصیرت کتنی ہی بلند کیوں نہ ہو وہ خدا کی وحی نہیں ہو سکتی۔

ممکن ہے، آپ یہ کہہ دیں کہ میں نے "خداداد بصیرت" کہا ہے۔ اور انسانی بصیرت اور خداداد بصیرت میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ اگر آپ کا یہ جواب ہے تو میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ کو جو بصیرت ملی ہے وہ خداداد ہے یا کسی اور کی عطا کردہ؟ ہر انسانی بصیرت خداداد ہی ہوتی ہے۔

وحی کے طریقے

۲۵۔ آپ نے وحی خداوندی کی مختلف اقسام کے ثبوت میں سورۃ الشوریٰ کی آیت ۵۱ پیش فرمائی ہے، اور اس کا ترجمہ آپ نے یہ کیا ہے:۔

> "کسی بشر کے لئے یہ نہیں ہے کہ اللہ اُس سے گفتگو کرے مگر وحی کے طریقے پر یا پردے کے پیچھے سے

یا اس طرح کہ ایک پیغمبر بھیجے اور وہ اللہ کے اذن سے وحی کرے جو کچھ اللہ چاہتا ہو، وہ برتر اور حکیم ہے۔"

اوّل تو آپ نے طلوعِ قرآنی بصیرت کے مطابق) اس آیت کے آخری حصّے کے معنی ہی صحیح نہیں سمجھے۔ میں اس آیت سے یہ سمجھتا ہوں کہ اس میں اللہ تعالیٰ صرف انبیائے اکرامؑ سے ہمکلام ہونے کے طریقوں کے متعلق بیان نہیں کر رہا، بلکہ اس میں بتایا گیا ہے کہ اس کا ہر بشر کے ساتھ بات کرنے کا طریقہ کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ انسانوں کی دو قسمیں ہیں، ایک حضرات انبیائے اکرامؑ اور دوسرے غیر نبی انسان۔ اس آیت کے پہلے دو حصّوں میں حضرات انبیائے اکرامؑ سے کلام کرنے کے دو طریقوں کا ذکر ہے۔ ایک طریقے کو وحی سے تعبیر کیا گیا ہے، جس سے مطلب ہے قلبِ نبوی پر وحی کا نزول جو حضرت جبریلؑ کی وساطت سے ہوتا تھا۔ اور دوسرا طریقہ تھا براہِ راست خدا کی آواز جو پردے کے پیچھے سے سُنائی دیتی تھی۔ اور اس کا خصوصی ذکر حضرت موسیٰ علیہ السّلام کے تذکرہ میں ملتا ہے۔ اس کے متعلق قرآن کریم میں وضاحت ہے کہ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ﴿[illegible]﴾ اور دوسرے مقام پر ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے اس کی خواہش ظاہر کی کہ "جو ذات مجھ سے یوں پس پردہ کلام کرتی ہے میں اُسے بے نقاب دیکھنا چاہتا ہوں۔" اس حصّے سے یہ مفہوم لینا کہ انبیائے کرامؑ کو خوابوں کے ذریعہ وحی ملا کرتی تھی کسی طرح بھی ثابت نہیں ہو سکتا۔ آیت کے تیسرے حصّے میں یہ بتایا گیا ہے کہ عام انسانوں سے خدا کی بات کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ وہ ان کی طرف رسول بھیجتا ہے۔ اس رسول کی طرف خدا وحی کرتا ہے اور رسول اس وحی کو عام انسانوں تک پہنچاتا ہے۔ بالفاظِ دیگر ہم جب قرآنِ کریم پڑھتے ہیں تو خدا ہم سے باتیں کر رہا ہوتا ہے۔

اس تمہیدی گفتگو کے بعد میں بتانا چاہتا ہوں کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے وحی بھیجنے کے مختلف طریقے بتائے ہیں، وحی کی مختلف اقسام نہیں بتائیں۔ جو وحی انبیائے اکرامؑ کو ملتی تھی اس کی مختلف قسموں کا ذکر قرآن میں کہیں نہیں آیا، نہ ہی قرآن میں کہیں یہ ذکر آیا ہے کہ قرآن صرف ایک قسم کی وحی کا مجموعہ ہے۔ اور باقی اقسام کی وحییں جو رسول اللہ کو دی گئی تھیں وہ کہیں اور درج ہیں۔ اس کے برعکس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے خود قرآنِ کریم میں یہ کہلوایا گیا ہے کہ اُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ ﴿[illegible]﴾ "میری طرف یہ قرآن وحی کیا گیا۔"

کیا قرآن میں کسی ایک جگہ بھی درج ہے کہ میری طرف قرآن وحی کیا گیا اور اس کے علاوہ اور بھی وحی ملی ہے جو اس میں درج نہیں۔؟ اصل یہ ہے کہ آپ وحی کی اہمیت کو سمجھے ہی نہیں۔ وحی پر ایمان لانے سے ایک شخص مومن ہو سکتا ہے۔ اور یہ ایمان تمام و کمال وحی پر ایمان لانا ہوتا ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ وحی کے ایک حصّہ پر ایمان لایا جائے اور دوسرے حصّے پر ایمان نہ لایا جائے۔ ایک حصّے سے انکار تو ایک طرف، وحی کے ایک لفظ کے انکار سے بھی کفر لازم آ جاتا ہے۔

آپ سوچئے کہ جس خدا نے وحی پر اس انداز سے ایمان لانے پر انسانوں کو مکلّف ٹھہرایا ہو تو کیا اس کے لئے ضروری نہیں تھا کہ وہ اس امر کی تصریح کر دے کہ وہ وحی کیا ہے، اور وہ تمہیں کہاں کہاں ملیگی۔؟ وحی کے ایک حصّے کا اس صراحت سے ذکر کرنا اور دوسرے حصّے کے متعلق بالصراحت قرآن میں کچھ نہ کہنا اور پھر اس پر ایمان نہ لانے سے انسان کو کافر قرار دینا

" می دسزد خدائے را "

یہ وہ چیز ہے جس کے متعلق آپ کا اپنا ارشاد یہ ہے:-

" یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ جن چیزوں پر کفر و اسلام کا مدار ہے، اور جن امور پر انسانوں کی نجات موقوف ہے، انھیں بیان کرنے کا اللہ تعالیٰ نے خود ذمہ لیا ہے، اور وہ سب قرآن میں بیان کیے گئے ہیں۔ اور قرآن میں بھی ان کو کچھ اشارۃً وکنایۃً بیان نہیں کیا گیا، بلکہ پوری صراحت و وضاحت سے ان کو کھول دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى - (رسائل مسائل صفحہ [illegible])

کیا کسی جگہ بھی قرآن میں "پوری صراحت و وضاحت سے" یہ کہا گیا ہے کہ وحی قرآن کے علاوہ کہیں اور بھی ہے؟ آپ نے خارج از قرآن وحی کے ثبوت میں جو آیات پیش کی ہیں (اور جن کا ذکر میں آگے چل کر وں گا) ان میں بھی یہ چیز کہیں صراحت سے درج نہیں۔ آپ ان کے متعلق زیادہ سے زیادہ یہی کہہ سکتے ہیں کہ ان سے اشارتاً یہ چیز ظاہر ہوتی ہے۔ اور جیسا کہ آپ کے اقتباس سے واضح ہے، اس کا اشارتاً ذکر وحی کی دلیل نہیں بن سکتا۔ اس کے برعکس (جیسا کہ میں اوپر لکھ چکا ہوں) اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ اقدس سے بصراحت و وضاحت یہ کہلوایا ہے کہ "میری طرف یہ قرآن وحی ہوا ہے"۔ اور جہاں بحضورِ ربّ العزت حضورؐ کی ایک شکایت کا ذکر کیا گیا ہے، وہاں بھی یہی کہا گیا ہے کہ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا (۲۵/۳۰)

۲۶۔ آپ نے لکھا ہے کہ قرآن کریم میں صرف وہی وحی درج ہے جو حضرت جبریلؑ کی وساطت سے حضورؐ پر نازل ہوئی تھی۔ پہلے تو یہ فرمائیے کہ آپ کو یہ کہاں سے معلوم ہو گیا کہ رسول اللہؐ کی طرف کوئی وحی حضرت جبریلؑ کی وساطت کے بغیر بھی آتی تھی-؟ دوسرے، غالباً آپ کو اس کا علم نہیں کہ جس وحی کو آپ جبریلؑ کی وساطت کے بغیر وحی کہتے ہیں (یعنی حدیث) اس کے متعلق۔ حدیث کو وحی ماننے والوں کا عقیدہ یہ ہے کہ اسے بھی جبریلؑ لے کر اسی طرح نازل ہوتے تھے جس طرح قرآن کو لے کر ہوتے تھے۔ (ملاحظہ فرمائیے جامع بیان العلم) اس لئے آپ کا یہ بیان خود آپ کے گروہ کے نزدیک بھی قابلِ قبول نہیں۔ سوچیئے کہ آپ کس قسم کی باتیں کر رہے ہیں، کہ جن کا نہ تو قرآن سے ثبوت ملتا ہے اور نہ آپ کے اسلاف ہی اس کی تائید کرتے ہیں۔ یاد رکھیے تنکوں کے پل بنا کر ان پر سے ہاتھی گزارنے کی کوشش لایعنی ہوتی ہے۔

کتاب و حکمت

۲۷۔ آپ نے یہ دلیل دی ہے کہ خدا نے "کتاب و حکمت" دونوں کو مُنَزَّل مِنَ اللہ کہا ہے۔ کتاب سے مراد قرآن ہے اور حکمت سے مراد سُنّت یا حدیث۔ آپ کی اس قرآن دانی پر جس قدر بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔ بندہ نواز! کتاب و حکمت میں واو عطف کی نہیں (جس کے معنی "اور" ہوتے ہیں) یہ واؤ تفسیری ہے۔ اس کا ثبوت خود قرآن میں موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کو خود حکیم (حکمت والا) کہا ہے۔ یٰسٓ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ (۳۶/۲) دوسری جگہ الکتٰب کو الحکیم کہا ہے۔ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ (۳۱/۲)

کہیں اسے صرف کتاب کہا ہے:۔ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ (۲/۲) اور کہیں صرف الحکمت جیسے ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ (۱۷/۳۹) لہٰذا کتاب و حکمت ایک ہی چیز ہے۔ "حکمت" کتاب کی تعریف و توصیف بیان کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن ان دونوں کا ذکر کرنے کے بعد ضمیر واحد کی لایا ہے:۔ وَمَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ (۲/۲۳۱)۔

قرآن کریم کی وہ آیات جنہیں میں نے اوپر درج کیا ہے اس کی دلالت کرتی ہیں کہ کتاب و حکمت دو الگ الگ چیزیں نہیں، بلکہ ایک ہی چیز ہے۔ (اور اسی بناء پر میں نے ضمیر واحد کا ذکر کیا ہے، ورنہ مجھے اس کا علم ہے کہ ضمیریں اور طرح بھی استعمال ہو جاتی ہیں)

ان تمام دلائل سے بڑھ کر وہ دلیل ہے جو سورۂ احزاب کی اس آیت میں موجود ہے، جسے آپ نے خود درج کیا ہے اور جس کے متعلق آپ نے اتنا بھی نہیں سوچا کہ آپ کیا فرما رہے ہیں۔ وہ آیت ہے:۔ وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ (۳۳/۳۴)۔ آپ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ اس وحی کو جو قرآن میں درج ہے آپ وحی متلو اور خارج از قرآن وحی کو وحی غیر متلو قرار دیا کرتے ہیں۔ اس آیت میں حکمت کو بھی "ما یتلیٰ" کہا گیا ہے۔ لہٰذا حکمت سے مراد وحی متلو ہے، وحی غیر متلو نہیں۔ دوسرے مقامات میں قرآن کو متلو کہا گیا ہے۔ مثلاً سورۂ کہف میں ہے:۔ وَاتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ (۱۸/۲۷) دوسری جگہ ہے:۔ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ وَاَنْ اَتْلُوَا الْقُرْاٰنَ (۲۷/۹۱-۹۲)۔ علاوہ ازیں قرآن کے متعدد مقامات میں "يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ" کے الفاظ آئے ہیں۔ احادیث کی تلاوت کا ذکر کہیں نہیں۔ اس لئے سورۂ احزاب میں جس حکمت کی تلاوت کا ذکر ہے اس سے مراد قرآن ہی ہے۔

اگر محض اس واؤ کی وجہ سے کتاب و حکمت دو الگ چیزیں مراد لی جائیں تو کہئے کہ قرآن کی اس آیت کا مفہوم کیا ہوگا جس میں کہا گیا ہے:۔ هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ (۴۸/۲۸) کیا اس میں بھی ہدایت اور دین دو الگ چیزیں ہیں۔ اگر الگ ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ دین میں (معاذ اللہ) ہدایت نہیں اور ہدایت میں دین شامل نہیں۔ دین ایک جگہ ہے اور ہدایت دوسری جگہ۔ اللہ اُمت کو آپ جیسے مفسروں کی گمراہی سے محفوظ رکھے، جو محض اپنی تفسیریں بیچنے کے لئے قرآن سے اس طرح مذاق کر رہے ہیں۔

۲۸۔ آپ کے بیان کے مطابق کتاب سے مراد ہوئی قرآن اور حکمت سے سُنّت رسول اللہ جو آپ کے الفاظ میں حضورؐ کے اقوال اور افعال دونوں پر مشتمل ہے۔ (ترجمان القرآن۔ دسمبر ۱۹۶۰ء صفحہ ۱۶۷)

کتاب و میزان

اس کے بعد آپ فرماتے ہیں:۔

"پھر قرآن مجید ایک اور چیز کا بھی ذکر کرتا ہے جو اللہ نے کتاب کے ساتھ نازل

کی ہے: (یعنی المیزان)

"اللہ ہی ہے جس نے نازل کی کتاب حق کے ساتھ اور میزان۔" (الشوریٰ۔ آیت ۱۷)

(ترجمان القرآن، دسمبر ۱۹۸۵ء، صفحہ ۱۵۸)

اس میزان کی تشریح کرتے ہوئے آپ فرماتے ہیں:-

"کتاب کے ساتھ اس چیز کو انبیاءؑ پر نازل کرنے کے صاف معنی یہ ہیں کہ انبیاءؑ کو اللہ تعالیٰ نے بطورِ خاص اپنے پاس سے وہ راہنمائی کی صلاحیت عطا فرمائی جس سے انھوں نے کتاب اللہ کے منشا کے مطابق افراد اور معاشرے اور ریاست میں نظامِ عدل قائم کیا۔" (ایضاً)

یعنی آپ کے بیان کے مطابق حسبِ ذیل چیزیں مُنَزَّل مِنَ اللہ ہوئیں۔

(۱)۔ کتاب، یعنی قرآنِ حکیم۔

(۲)۔ حکمت، یعنی رسول اللہؐ کے اقوال و افعال۔ اور

(۳)۔ میزان، یعنی رہنمائی کی صلاحیت۔

ظاہر ہے کہ یہ تیسری چیز نہ رسول اللہؐ کے اقوال میں شامل ہے نہ افعال میں۔ بالفاظِ دیگر جس طرح رسول اللہ کے اقوال اور افعال قرآن سے الگ تھے، اسی طرح حضورؐ کے اقوال و افعال اس آسمانی راہنمائی سے بھی الگ تھے جسے "المیزان" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

حیرت ہے کہ آپ نے سورۂ حدید کی آیت ۲۵ کا اتنا ہی حصہ کیوں نقل فرمایا جس میں کتاب اور میزان کا ذکر ہے۔ اور اس ٹکڑے کا ذکر کیوں نہ کیا جس میں کہا گیا ہے "وانزلنا الحدید" (اور ہم نے لوہا بھی نازل کیا) اس سے تو ظاہر ہے کہ کتاب، حکمت اور میزان کے ساتھ چوتھی چیز الحدید بھی اسی طرح مُنَزَّل مِنَ اللہ ہے۔

۲۹۔ مُنَزَّل مِن اللہ کی آپ کی یہ فہرست یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ آپ فرماتے ہیں:-

"پھر قرآن ایک تیسری چیز کی بھی خبر دیتا ہے جو کتاب کے علاوہ نازل کی گئی تھی۔" (ایضاً صفحہ ۱۵۸)

النُّور اس کے لئے آپ نے حسبِ ذیل تین آیات درج فرمائی ہیں:-

(۱)۔ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالنُّوْرِ الَّذِيْٓ اَنْزَلْنَا (التغابن۔۸) "پس ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسولؐ پر اور اس نور پر جو ہم نے نازل کیا ہے۔"

(۲)۔ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ (الاعراف، ۱۵۷)۔ "پس جو لوگ ایمان لائیں اس رسول پر اور اس کی تعظیم و تکریم کریں اور اس کی مدد کریں اور اس نور کے پیچھے چلیں جو اس کے ساتھ نازل کیا گیا ہے، وہی فلاح پانے والے ہیں۔"

(۳)۔ قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ۔ (المائدہ ۱۵-۱۶)۔ "تمہارے پاس آگیا ہے نور اور کتاب مبین جس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ ہر اُس شخص کو جو اس کی مرضی کی پیروی کرنے والا ہے، سلامتی کی راہیں دکھاتا ہے"۔

پہلی آیت میں اللہ اور رسولؐ اور النُّور پر ایمان لانے کا حکم ہے۔ گویا آپ کے خیال کے مطابق اللہ اور رسولؐ کے علاوہ ایمان لانے کا حکم نہ کتاب پر ہے نہ حکمت پر نہ میزان پر۔ بلکہ صرف چوتھی چیز جسے آپ کتاب و حکمت و میزان سے الگ قرار دیتے ہیں۔؟ دوسری آیت میں رسولؐ اللہ پر ایمان لانے کا ذکر ہے اور النُّور کے اتباع کا حکم۔ یعنی اس میں کتاب اور حکمت کے اتباع کا حکم نہیں۔ بالفاظِ دیگر آپ کے اس استدلال کے مطابق اگر کوئی شخص قرآن پر ایمان نہیں لاتا، صرف النُّور پر ایمان لاتا ہے، اور وہ قرآن کا اتباع بھی نہیں کرتا ہے تو وہ مؤمنین اور مفلحین کے زمرے میں داخل ہوگا؟

یہ النُّور کیا ہے؟ اس کی وضاحت میں آپ فرماتے ہیں کہ:۔

"اس سے مراد وہ علم و دانش اور وہ بصیرت و فراست ہی ہو سکتی ہے جو اللہ نے حضورؐ کو عطا فرمائی تھی"

(ترجمان القرآن دسمبر ۱۹۶۵ء صفحہ ۱۸۳)

چلو! قرآن پر ایمان لانے اور اس کا اتباع کرنے سے تو چھٹی پائی۔ بلکہ حضورؐ کے اقوال و افعال کی اطاعت سے بھی۔ کیونکہ ان آیات میں صرف النُّور کا ذکر ہے۔ سچ ہے، عقل کی تو کوئی آخری حد ہوتی ہے، لیکن جہالت کی کوئی حد مقرر نہیں کی جا سکتی۔

۳۰۔ آپ کی درج فرمودہ تیسری آیت میں نور و کتاب کا ذکر ہے۔ اس واؤ کے متعلق میں پہلے ذکر کر چکا ہوں، لیکن آپ اس سے دو الگ الگ چیزیں مراد لیتے ہیں۔ حالانکہ اس کے بعد بھی ضمیر واحد کی ہے۔ یَهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ اور اُس کا ترجمہ بھی آپ نے واحد ہی کیا ہے۔ جب لکھا ہے کہ:۔

"تمہارے پاس آگیا ہے نور اور کتاب جس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ ہر شخص کو جو اس کی مرضی کی پیروی کرنے والا ہے سلامتی کی راہیں دکھاتا ہے"۔

فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ سلامتی کی راہیں نور کے ذریعہ دکھاتا ہے یا کتاب کے ذریعہ۔؟ اگر آپ کہیں کہ دونوں کے ذریعہ تو اس کی شہادت آپ کا ترجمہ نہیں دیتا۔ اگر یہ دونوں الگ الگ تھے تو آپ کو لکھنا چاہیئے تھا۔ "تمہارے پاس آگئے ہیں نور اور کتاب مبین جن کے ذریعہ سے"۔ ضمناً آپ نے اپنے ترجمہ میں "مِنَ اللّٰهِ" کا ترجمہ نہیں کیا۔ اگر میں آپ کی تقلید میں کہہ دوں کہ آپ کو اتنی سی عربی بھی نہیں آتی تو فرمائیے کہ آپ کا احساس کیا ہوگا۔؟ لیکن میں ایسا نہیں کہوں گا، اس لئے کہ مجھے انا لموجود لاغیری کا دعویٰ نہیں۔

یا حضرت! حکمت کی طرح نور بھی قرآن ہی کی صفت ہے۔ قرآن وہ روشنی ہے جو ہر چیز کو واضح اور نمایاں کر دیتی ہے لیکن، اپنے لئے کسی اور روشنی کی محتاج نہیں۔ پھر اسے روشنی کہنے سے یہ بھی مقصود تھا کہ اس سے وہی مستفید ہو سکتا ہے جو اپنی آنکھیں

کھول کر رکھے۔ آپ کی طرح آنکھیں بند رکھنے والوں کو نور کوئی فائدہ نہیں دے سکتا۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

مکتب و مُلّا و اسرارِ کتاب کورِ مادر زاد و نورِ آفتاب!

۳۱۔ میں دیکھ رہا تھا کہ آپ نے مُنَزَّل مِنَ اللہ چیزوں کی فہرست میں کیا کیا اور شامل کیا ہے۔ لیکن آپ نے تو اُسے یہیں ختم کر دیا۔ قرآن نے ان کے علاوہ ذکر، رُوح، بُرہان، ھُدٰی وغیرہ کے مُنَزَّل مِنَ اللہ یا وحی ہونے کا بھی تو ذکر کیا ہے۔ اُنکے متعلق بھی کچھ ارشاد فرما دیا ہوتا کہ ان سے قرآن کے علاوہ اور کیا مراد ہے۔ اسی ضمن میں آپ نے یہ لکھا ہے کہ "قرآن مجید میں جہاں نازل کرنے کے ساتھ کتاب یا ذکر یا فرقان کی تصریح کی گئی ہے، صرف اسی جگہ مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ سے مراد قرآن ہے" (۱۱ دیفعہ؟)۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کے پاس اس حصر کی دلیل کیا ہے؟ اور اس بات کی دلیل کیا ہے کہ ان مقامات میں تو مراد قرآن ہے اور دوسرے مقامات میں مراد وحی خارج از قرآن ہے۔؟ کیا یہ تفریق آپ کے ذہنِ رسا کی پیداوار نہیں ہے؟ کیا اس قسم کی اختراعات پر آپ کو کچھ خدا کا خوف نہیں آتا کہ آپ خدا کی کتاب کو وہ معنی پہنا رہے ہیں جو ——— اقبالؒ کے الفاظ میں ——— "خدا، رسولؐ اور جبریلؑ کو بھی حیرت میں ڈال دیں"۔

۳۲۔ ان تصریحات کے بعد مجھے اُن مقامات کی طرف آنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی جن سے آپ نے (قرآن سے جہالت کی بنا پر) یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ کتاب (معاذ اللہ) ناقص ہے۔ یہ ان چیزوں کا ذکر کرتی ہے، جو اس میں وضاحت سے مذکور نہیں، اور ان کے لئے ہمیں دوسرے مقامات کی طرف رجوع کرنا ہوتا ہے۔ اور وہ مقامات ہیں وحیِ خارج از قرآن۔ لیکن چونکہ آپ اس خط و کتابت کے پچھلے حصے کو میرے جواب کا انتظار کئے بغیر شائع کر چکے ہیں جس سے آپ کے سادہ لوح مریدوں کے اندر گمراہ ہونے کا امکان ہے۔ اس لئے میں ان کے متعلق بھی مختصراً عرض کئے دیتا ہوں۔ ممکن ہے ان میں سے بعض سعید روحیں اس گمراہی سے نکل سکیں۔ ورنہ آپ کے راہِ راست پر آنے کی تو کوئی امید نہیں۔ امارت اور قیادت کی جاذبیتیں انسان کو کبھی صحیح راستے کی طرف آنے نہیں دیا کرتیں۔ اس پر خود قرآن شاہد ہے۔

۳۳۔ سب سے پہلے اس آیت کو لیجئے جس کے متعلق آپ فرماتے ہیں کہ:-

"یہ ایسی ہر تاویل کی جڑ کاٹ دیتی ہے اور ساتھ ساتھ آپ کے اس مفروضے کا بھی قلع قمع کر دیتی ہے کہ رسول اللہ پر قرآن کے سوا اور کسی صورت میں وحی نہیں آتی تھی"۔ (ترجمان اکتوبر ۱۹۶۰ء، صفحہ ۴۹)

تحویلِ قبلہ کی آیت

آپ نے وہ آیت اور اس کا ترجمہ یوں لکھا ہے:-

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِیْ كُنْتَ عَلَیْھَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ یَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ یَّنْقَلِبُ عَلٰی عَقِبَیْهِ (۲/۱۴۳)۔ "اور ہم نے وہ قبلہ جس پر اب تک تم تھے اسی لئے مقرر کیا تھا تاکہ یہ دیکھیں کہ کون رسول کی پیروی کرتا ہے، اور کون اُلٹے پاؤں پھر جاتا ہے"۔

اس کے متعلق آپ لکھتے ہیں کہ:-

"مسجدِ حرام کو قبلہ قرار دینے سے پہلے مسلمانوں کا جو قبلہ تھا اُسے قبلہ بنانے کا کوئی حکم قرآن میں نہیں آیا۔ اگر آیا ہو تو آپ اس کا حوالہ دیدیں۔" (ترجمان القرآن اکتوبر ۱۹۶۰ء صفحہ ۱۵)

اگر اس کے متعلق خدا کی طرف سے کوئی حکم آیا ہوتا تو ضرور قرآن میں ہوتا۔ لیکن جب حکم آیا ہی نہیں تو میں اس کا حوالہ قرآن سے کیسے دوں ؟۔ آپ نے پہلے یہ فرض کرلیا ہے کہ پہلے قبلے کو خدا نے مقرر کیا تھا، اور اس کے بعد آپ اس آیت کا ترجمہ اسی مفروضہ کے مطابق کرتے ہیں۔ اس آیت میں "کُنْتَ" کے معنی "تو تھا" نہیں۔ اس کے معنی ہیں "تو ہے"۔ یعنی "ہم نے وہ قبلہ جس پر تو ہے اس لئے مقرر کیا تاکہ یہ دیکھیں کہ کون رسول کی پیروی کرتا ہے، اور کون اُلٹے پاؤں پھر جاتا ہے"۔ ان معانی کی تائید خود قرآن سے ہوتی ہے۔

سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ اگر تسلیم کرلیا جائے کہ پہلا قبلہ خدا نے مقرر کیا تھا تو اس ٹکڑے کے کچھ معنی ہی نہیں بنتے کہ "ہم نے یہ اس لئے کیا تھا تاکہ یہ دیکھیں کہ کون رسول کی پیروی کرتا ہے اور کون اُلٹے پاؤں پھر جاتا ہے"۔ اس لئے کہ پہلے قبلے کے تقرر کے وقت کسی کے اُلٹے پاؤں پھر جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ حضورؐ ایک قبلے کی طرف رُخ کرتے تھے۔ جو شخص حضورؐ کے ساتھ شریک ہوتا تھا وہ بھی اسی طرف رُخ کرلیتا تھا۔ "اُلٹے پاؤں پھرنے" کا سوال اُس وقت پیدا ہوا جب اس قبلے میں تبدیلی کی گئی۔ اُس وقت اس کے پرکھنے کا موقعہ آیا کہ کون اُسی پہلے قبلے کو زیادہ عزیز رکھتا ہے، اور کون رسول کے اتباع میں (جس نے بحکمِ خداوندی یہ تبدیلی کی ہے) نئے قبلے کی طرف رُخ کرتا ہے ؟

یہ بات کہ اس نئے قبلے کا حکم ہی خدا کی طرف سے آیا تھا پہلے قبلے کا نہیں، دوسری آیات میں قرآن نے واضح کردی، جہاں کہا ہے کہ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُمْ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ إِنَّكَ إِذًا لَمِنَ الظَّالِمِينَ (۲/۱۴۵) یعنی "اگر تو العلم آجانے کے بعد ان لوگوں کی خواہشات کا اتباع کریگا تو تو اس وقت بے شک ظالموں میں سے ہوجائے گا"۔

اس سے صاف واضح ہے کہ العلم (یعنی وحیِ خداوندی) نئے قبلے کے لئے آئی تھی۔ اگر پہلا قبلہ بھی العلم کے مطابق مقرر ہوتا تو یہاں یہ کبھی نہ کہا جاتا کہ "العلم کے آنے کے بعد تم پہلے قبلے کی طرف رُخ نہ کرنا"۔

یہ ہے اس آیت کا صحیح مفہوم جس سے متعلق آپ نے فرمایا ہے کہ "وہ ہر دعوے کی جڑ کاٹ دیتی ہے"۔

رُؤیا کے متعلق آیت

۳۲۔ دوسری آیت آپ نے یہ پیش کی ہے کہ لَقَدْ صَدَقَ اللَّهُ رَسُولَهُ الرُّؤْيَا بِالْحَقِّ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ إِنْ شَاءَ اللَّهُ آمِنِينَ مُحَلِّقِينَ رُءُوسَكُمْ وَمُقَصِّرِينَ لَا تَخَافُونَ فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوا فَجَعَلَ مِنْ دُونِ ذَٰلِكَ فَتْحًا قَرِيبًا۔ (۴۸/۲۷) اور اس کا ترجمہ کیا ہے:۔ "اللہ نے اپنے رسول کو سچا خواب دکھایا......"

اوّل تو یہ فرمایئے کہ آپ نے "صَدَقَ اللَّهُ رَسُولَهُ الرُّؤْيَا" کا ترجمہ "اللہ نے سچا خواب دکھایا" کس قاعدے

کی رُو سے کیا ہے؟ "صَدَقَ الرُّءْیَا" کے معنی "اس نے سچا خواب دکھایا" ہو ہی نہیں سکتے۔ اس کے معنی ہیں "خواب کو سچا کر دکھایا" جیسے "لَقَدْ صَدَقَ اللّٰہُ وَعْدَہٗ" کے معنی ہیں "اللہ نے اپنا وعدہ پورا کر دیا"۔ یہ نہیں کہ "اللہ نے تم سے سچا وعدہ کیا"

آپ نے اپنے ترجمے کی رُو سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ حضورؐ کا یہ خواب بھی از قبیلِ وحی تھا۔ خواب کو وحی قرار دینا وحی کی حقیقت سے بے خبری کی دلیل ہے۔ آپ حضرات کے اسی قسم کے اعتقادات ہیں جن سے مرزا غلام احمد صاحب کو دعوئ نبوت کی جرأت ہو گئی۔ وہ بھی اپنے خوابوں کو الہامی قرار دیتے تھے۔ اور جب وہ جھوٹے ثابت ہوتے تھے تو کہہ دیا کرتے تھے کہ خود رسول اللہ نے جو خواب دیکھا تھا انھوں نے اُسے (معاذ اللہ) غلط سمجھا تھا۔ اور ان کا یہ جواب بھی آپکے اسی باطل عقیدہ کا نتیجہ ہے۔ آپ نے لکھا ہے:۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینے میں خواب دیکھتے ہیں کہ آپؐ مکہ میں داخل ہوئے ہیں اور بیت اللہ کا طواف کیا ہے۔ آپؐ اس کی خبر صحابہ کرامؓ کو دیتے ہیں اور وہ عمرہ ادا کرنے کے لئے روانہ ہو جاتے ہیں۔ کفارِ مکہ آپ کو حدیبیہ کے مقام پر روک لیتے ہیں اور اس کے نتیجہ میں صلح حدیبیہ واقع ہوتی ہے۔ بعض صحابیؓ اس خلجان میں پڑ جاتے ہیں، اور حضرت عمرؓ ان کی ترجمانی کرتے ہوئے پوچھتے ہیں کہ یا رسول اللہ کیا آپؐ نے ہمیں خبر نہ دی تھی کہ ہم مکہ میں داخل ہوں گے اور طواف کریں گے۔؟ آپؐ نے فرمایا کیا میں نے یہ کہا تھا کہ اس سفر میں ایسا ہو گا۔؟" (ترجمان القرآن، نومبر صفحہ ۱۱)

آپ نے اس اعتراض سے بچنے کے لئے (کہ معاذ اللہ خود حضورؐ کو اپنی وحی کا صحیح مفہوم سمجھنے میں غلطی لگ گئی تھی) یہ اختراع فرمائی ہے کہ "حضورؐ کو خواب کے ذریعے مکہ میں داخل ہونے کا یہ طریقہ بتایا گیا تھا کہ آپ اپنے ساتھیوں کو لیکر مکہ کی طرف جائیں کفار روکیں گے۔ آخر کار صلح ہو گی جس کے ذریعے سے دوسرے سال عمرہ کا موقعہ بھی ملے گا، اور آئندہ کی فتوحات کا راستہ بھی کھل جائے گا۔ کیا یہ قرآن کے علاوہ دوسرے طریقوں سے وحی ملنے کا کھلا ثبوت نہیں۔؟" (ایضاً)

آپ نے اپنی طرف سے تو بڑا تیر مارا کہ اس اختراع سے آپ اس اعتراض سے بچ گئے، لیکن اتنا نہ سوچا کہ اس سے خود نبی اکرمؐ کی ذاتِ اقدس و اعظم کے خلاف کتنا بڑا طعن پڑتا ہے۔ آپ کو اس سے کیا غرض؟ طعن پڑتا ہے تو پڑا کرے، آپ نے تو (بزعم خویش) میدان مار لیا۔

جو واقعہ آپ نے شروع سے آخر تک لکھا ہے اُس سے واضح ہوتا ہے کہ:۔

(۱)۔ رسولؐ اللہ کو شروع ہی سے اللہ کی طرف سے اطلاع ملی تھی کہ آپ اس سال روکے جائیں گے اور اگلے سال مکہ میں داخلہ ہو گا۔

(۲)۔ رسولؐ اللہ نے اس کی اطلاع صحابہؓ میں سے کسی کو نہ دی، بلکہ انھیں یہ تاثر دیا کہ مکہ میں داخلہ اس سفر میں ہو گا۔ جبھی تو صحابہؓ خلجان میں پڑ گئے۔ اور حضرت عمرؓ جیسے قریبی صحابی کو یہ کہنا پڑا کہ آپؐ نے تو ہم سے کہا تھا کہ ہم مکہ میں داخل ہوں گے

اور طواف کریں گے - پھر یہ کیا ہوا ؟ -

ذرا سوچئے کہ اس سے رسول اللہ کے متعلق کیا تصور قائم ہوتا ہے ؟ اللہ تعالیٰ وحی کے ذریعہ آپ کو ایک بات کی خبر دیتا ہے؟ اور آپ صحابہؓ سے پوری بات (معاذاللہ) چھپا کر رکھتے ہیں - اور انہیں (توبہ توبہ) غلط تاثر دیکر ساتھ لے چلتے ہیں - جب راستہ رُک جاتا ہے تو اس وقت بھی یہ نہیں فرماتے کہ مجھے اللہ نے ان باتوں کا پہلے علم دیدیا تھا - داخلہ ہمارا اگلے سال ہونا ہے - صرف اتنا فرماتے ہیں کہ میں نے یہ کب کہا تھا کہ اسی سال داخلہ ہوگا -

اللہ تعالیٰ آپ لوگوں کو ہدایت دے - کیا آپ کو حضورؐ کی ذاتِ گرامی کا بھی کچھ پاس نہیں ؟ لیکن آپ کو کیا پاس ہو سکتا ہے آپ تو اپنے جھوٹوں کے جواب میں یہاں تک کہہ چکے ہیں کہ ایسے مواقع پر (معاذاللہ معاذاللہ) حضورؐ نے بھی جھوٹ بولنے کی نہ صرف اجازت دی تھی بلکہ اسے واجب قرار دیا تھا - اس سے بھی آگے بڑھئے ، آپ نے تو یہاں تک صدیدہ دہنی سے کام لیا ہے کہ یہ کہتے ہوئے بھی نہیں شرمائے کہ جب تک حکومت حاصل نہیں ہوئی تھی اس وقت حضورؐ مساواتِ انسانی کا سبق دیتے رہے اور جب حکومت حاصل ہو گئی تو اس وعظ و تلقین کو (خاکم بدہن) بالائے طاق رکھکر حضورؐ نے حکومت کو اپنے خاندان میں محدود کر لیا ! (استغفراللہ ثم استغفراللہ) -

جو شخص اس ذاتِ گرامیؐ کے خلاف یہ کچھ کہنے کی جرأت کر سکتا ہے ، اس نے اگر یہ کہدیا کہ حضورؐ نے پوری بات اپنے قریب ترین صحابہؓ سے بھی چھپا رکھی تھی ، تو اسے اس سے کیا شرم آئے گی -

پھر یہ بھی سوچئے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو پہلے ہی بتا رکھا تھا کہ یہ معاملہ آخر تک یوں ہوگا تو پھر صحابہؓ کے دریافت کرنے پر اللہ تعالیٰ کو یہ کہنے کی ضرورت کیا پڑی تھی کہ " اللہ نے اپنے رسولؐ کو سچا خواب دکھایا تھا - تم مسجدِ حرام میں انشاءاللہ ضرور داخل ہو گے " اس تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ (معاذاللہ) خود حضورؐ کو تردد ہو گیا تھا کہ معلوم نہیں خدا نے مجھے سچا خواب دکھایا تھا یا یونہی کہہ دیا تھا کہ مکہ چلے جاؤ ، تم مسجدِ حرام میں داخل ہو جاؤ گے ، اور اس تردد کو دور کرنے کے لئے خدا کو بارِ دیگر یہ یقین دلانا پڑا کہ آپ متردد نہ ہو جئے ، ہم نے سچا خواب دکھایا تھا ، آپ ضرور مسجدِ حرام میں داخل ہوں گے -

مولانا ! ذرا سوچئے کہ آپ محض اپنے عقیدتمندوں کے حلقے میں سچا بننے کے لئے کیا کیا حرکات کر رہے ہیں ؟ بات کس قدر صاف تھی - حضورؐ نے ایک خواب دیکھا اور اس کے مطابق مکہ کی طرف روانہ ہو گئے - اللہ نے اس خواب کو سچا کر دکھایا اور حضورؐ مکہ میں داخل ہو گئے - اس میں کون سی پیچیدگی تھی جس کے حل کرنے کے لئے آپ کو اس قدر افسوسناک افسانے تراشنے کی ضرورت لاحق ہوئی -

۳۵ - تیسری آیت آپ نے یوں پیش کی ہے :-

بیویوں سے بات کرنے والی آیت

" نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بیویوں میں سے ایک کو رازمیں ایک بات بتاتے ہیں - وہ اس کا ذکر دوسری

سے کر دیتی ہیں۔ حضورؐ اس پر باز پُرس کرتے ہیں تو وہ پوچھتی ہیں کہ آپؐ کو یہ کیسے معلوم ہو گیا کہ میں نے یہ بات دوسروں سے کہدی ہے۔ حضورؐ جواب دیتے ہیں کہ "نَبَّانِیَ الْعَلِیْمُ الْخَبِیْرُ" مجھے علیم و خبیر نے خبر دی ہے۔ (ترجمان القرآن نومبر صفحہ ۲۱۸)

اس کے بعد آپ پوچھتے ہیں:۔

"فرمائیے کہ قرآن میں وہ آیت کہاں ہے، جس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اطلاع دی تھی کہ تمہاری بیوی نے تمہاری راز کی بات دوسروں سے کہدی ہے۔؟ اگر نہیں ہے تو ثابت ہوا یا نہیں کہ اللہ تعالیٰ قرآن کے علاوہ بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پیغامات بھیجتا تھا؟"

جی ہاں! آپ کے حاشیہ نشینوں کے نزدیک تو بالکل ثابت ہو گیا، لیکن ذرا قرآنی حقائق پر سنجیدگی سے غور کرنے والوں سے پوچھئے کہ وہ کیا کہتے ہیں۔؟

پہلے تو یہ فرمائیے کہ حضورؐ نے جب کہا کہ مجھے "علیم و خبیر" نے خبر دی ہے تو اس سے یہ کیسے ثابت ہو گیا کہ حضورؐ نے فرمایا تھا کہ مجھے خدا نے خبر دی ہے۔ کیا اس سے یہ مفہوم نہیں کہ حضورؐ کو اس نے خبر دی جسے اس راز کی علم و آگہی ہو گئی تھی۔؟

لیکن میں اس مفہوم پر بھی اصرار نہیں کرتا اور تسلیم کئے لیتا ہوں کہ "العلیم الخبیر" سے مراد اللہ تعالیٰ ہی ہیں۔ لیکن اس سے یہ کیسے ثابت ہو گیا کہ خدا نے یہ اطلاع بذریعۂ وحی دی تھی۔؟ جس شخص نے قرآن کریم کو ذرا بھی تعمق پڑھا ہے، اُس سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ جب کسی کے علم کو خدا اپنی طرف منسوب کرتا ہے اُس سے مراد (بالضرور) وحی کے ذریعہ علم دینا نہیں ہوتا۔ مثلاً سورۂ مائدہ میں ہے:۔ وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ (۵/۴) "اور جو تم شکاری جانوروں کو سکھاتے ہو، تم انہیں اُس علم کے ذریعہ سکھاتے ہو جو اللہ نے تمہیں سکھایا ہے"۔

فرمائیے! کیا یہاں عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ سے یہ مراد ہے کہ اللہ شکاری جانوروں کو سدھانے والوں کو بذریعۂ وحی سکھاتا ہے کہ تم ان جانوروں کو اس طرح سدھاؤ؟ یا "عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ" یا "عَلَّمَ بِالْقَلَمِ" (۹۶/۴-۵) کے یہ معنی ہیں کہ اللہ ہر انسان کو بذریعۂ وحی وہ کچھ سکھاتا ہے جسے وہ نہیں جانتا۔ اور خود قلم ہاتھ میں لیکر سکھاتا ہے۔ یا مثلاً سورۂ بقرہ میں ہے کہ کاتب لکھنے سے انکار نہ کرے "كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ" (۲/۲۸۲) جیسا کہ اللہ نے اسے سکھایا ہے۔ کیا اللہ کاتبوں کو کتاب بذریعۂ وحی سکھاتا ہے؟ یا اسی سورۃ میں دوسری جگہ ہے کہ جب عورتیں حیض سے پاک ہو جائیں تو "فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ" (۲/۲۲۲) "ان کے پاس جاؤ جس طرح اللہ نے تمہیں حکم دیا ہے"۔

فرمائیے کہ اگر کوئی جاہل آپ ہی کی طرح پوچھ بیٹھے کہ بتاؤ۔ اللہ نے یہ حکم کہاں دیا ہے؟ تو اس کا کیا جواب دیا جائے گا؟ اسکا جواب وہی ہے جو آپ نے خود اپنی تفسیر میں دیا ہے۔ کہ

"یہاں حکم سے مراد حکم شرعی نہیں بلکہ وہ فطری حکم مراد ہے جو حیوان اور انسان سب کی فطرت میں

ودیعت کیا گیا ہے۔ اور جس سے ہر متنفس بالطبع واقف ہے"۔

جس طرح ان آیات میں اللہ کے علم یا حکم دینے سے مراد علم و حکم بذریعۂ وحی نہیں، اسی طرح نَبَّأَنِيَ الْعَلِيمُ الْخَبِيرُ میں بذریعۂ وحی اطلاع دینا مراد نہیں۔ حضورؐ نے اس بات کا علم اسی طرح حاصل کیا تھا جس طرح ایسے حالات میں علم حاصل کیا جاتا ہے۔

حضرت زیدؓ سے متعلق آیت

۳۶۔ چوتھی آیت آپ نے اس طرح پیش کی ہے:۔

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ بولے بیٹے زیدؓ بن حارث اپنی بیوی کو طلاق دیتے ہیں اور اس کے بعد حضورؐ ان کی مطلقہ بیوی سے نکاح کر لیتے ہیں۔ اس پر مخالفین اور منافقین حضورؐ کے خلاف پروپیگنڈے کا ایک طوفان اٹھا کھڑا کر دیتے ہیں اور اعتراضات کی بوچھاڑ کر دیتے ہیں۔ ان اعتراضات کا جواب اللہ تعالیٰ سورۂ احزاب کے ایک پورے رکوع میں دیتا ہے کہ نبی نے یہ نکاح خود نہیں کیا ہے بلکہ ہمارے حکم سے کیا ہے۔ فَلَمَّا قَضَىٰ زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنَاكَهَا لِكَيْ لَا يَكُونَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ حَرَجٌ فِي أَزْوَاجِ أَدْعِيَائِهِمْ إِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا (۳۳/۳۷)۔ "پھر جب زید کا جی اس سے بھر گیا تو ہم نے اُس (خاتون) کا نکاح تم سے کر دیا تاکہ اہلِ ایمان کیلئے اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں سے نکاح کرنے میں کوئی حرج نہ رہے جبکہ وہ اُن سے جی بھر چکے ہوں (یعنی انھیں طلاق دے چکے ہوں)"۔ (ایضاً)

اس کے بعد آپ پوچھتے ہیں کہ اللہ نے نبی اکرمؐ کو جو حکم دیا تھا کہ تم زید کی بیوی سے نکاح کر لو تو وہ قرآن میں کہاں ہے؟ پہلے تو یہ دیکھئے کہ آپ نے دو مرتبہ لکھا ہے کہ حضورؐ نے وہ نکاح "خدا کے حکم" سے کیا تھا۔ حالانکہ آیت میں فقط یہ ہے کہ "زَوَّجْنَاكَهَا" جس کا ترجمہ آپ نے بھی یہ کیا ہے کہ "ہم نے اس خاتون کا نکاح تم سے کر دیا"۔ جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں، قرآن کریم کا انداز یہ ہے کہ جو باتیں خدا کے بنائے ہوئے قاعدے اور قانون کے مطابق کی جائیں انھیں خدا اپنی طرف منسوب کرتا ہے، خواہ وہ کسی کے ہاتھوں سرزد ہوئی ہوں۔ جیسے (مثلاً) سورۂ انفال میں مقتولینِ جنگ کے متعلق ہے فَلَمْ تَقْتُلُوهُمْ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ قَتَلَهُمْ (۸/۱۷) "انھیں تم نے قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے قتل کیا"۔ حالانکہ ظاہر ہے کہ یہ قتل جماعتِ مومنین کے ہاتھوں ہی سرزد ہوا تھا۔ یا جس طرح (مثلاً) سورۃ بقرۃ میں کہا کہ خَتَمَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ (۲/۷)۔ "اللہ نے اُن کے دلوں پر مُہر لگا دی"۔ اور دوسری جگہ اس کی وضاحت یہ کہہ کر دی کہ كَلَّا ۖ بَلْ ۜ رَانَ عَلَىٰ قُلُوبِهِم مَّا كَانُوا يَكْسِبُونَ (۸۳/۱۴) "ہرگز نہیں! بلکہ وہی اُن کے دلوں پر زنگ بیٹھ گیا جو وہ کماتے تھے"۔ یعنی خود اُن کے اعمال نے اُن کے دلوں پر مُہریں لگا دیں۔ یہی مطلب "زَوَّجْنَاكَهَا" سے ہے۔ یعنی حضورؐ نے وہ نکاح خدا کے قانون کے مطابق کیا۔ وہ قانون یہ تھا کہ تم پر حرام ہیں:۔ حَلَائِلُ أَبْنَائِكُمُ الَّذِينَ مِنْ أَصْلَابِكُمْ (۴/۲۳) "تمہارے اُن بیٹوں کی بیویاں جو تمہارے صلب سے ہوں"۔ اور چونکہ منہ بولا بیٹا صلبی بیٹا نہیں ہوتا، اس لئے اُس کی

بیوی سے نکاح حرام نہیں، جائز ہے۔ حضورؐ نے خدا کے اسی حکم مطابق حضرت زیدؓ کی مطلقہ بیوی سے نکاح کیا تھا۔

بنی نضیر سے متعلق آیت

۳۷۔ پانچویں آیت آپ نے یہ پیش کی ہے کہ حضورؐ نے جب بنی نضیر کے خلاف فوج کشی کی تو اُس وقت گروہ پیش کے بہت سے درخت کاٹ ڈالے تاکہ حملہ کرنے کے لئے راستہ صاف ہو۔ اس پر اللہ نے کہا کہ مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَآئِمَةً عَلٰٓى اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ (۵۹/۵) "کھجوروں کے درخت جو تم نے کاٹے اور جو کھڑے رہنے دیئے یہ دونوں کام اللہ کی اجازت سے تھے"۔ اس پر آپ پوچھتے ہیں کہ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ یہ اجازت قرآنِ کریم کی کس آیت میں نازل ہوئی تھی۔؟

سورۂ حج کی اُس آیت میں جس میں کہا گیا ہے کہ "اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا (۲۲/۳۹)۔ "ان لوگوں کو جن کے خلاف جنگ کی جاتی ہے جنگ کی اجازت دی جاتی ہے کیونکہ اُن پر ظلم کیا گیا ہے"۔

اس آیت میں جماعتِ مؤمنین کو ظالمین کے خلاف جنگ کی اجازت دی گئی۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جنگ کی اس اصولی اجازت میں ہر اس بات کی اجازت شامل ہے، جو قاعدے اور قانون کی رُو سے جنگ کے لئے ضروری ہو۔ جو بات خدا کے مقرر کردہ قاعدے کی رو سے اور قانون کے مطابق ہو قرآن اسے "بِاِذْنِ اللّٰهِ" سے تعبیر کرتا ہے۔ مثلاً فَمَآ اَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ فَبِاِذْنِ اللّٰهِ (۳/۱۶۶) "اور جو کچھ تمہیں اس دن مصیبت پہنچی جب دو گروہ آمنے سامنے ہوئے تھے تو وہ بِاِذْنِ اللّٰهِ تھا"۔ خواہ وہ قانون خارجی کائنات میں ہی کیوں نہ کارفرما ہو۔ مثلاً وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهٗ بِاِذْنِ رَبِّهٖ (۷/۵۸) "اور اچھی زمین کا سبزہ اس کے رب کے اذن سے (خوب) نکلتا ہے"۔ "بِاِذْنِ اللّٰهِ" کیلئے وحی کا حوالہ نہیں تلاش کیا کرتے!

جنگِ بدر سے متعلق آیت

۳۸۔ چھٹی آیت آپ نے یہ پیش کی ہے:۔

"وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ" (۸/۷) "اور جب کہ اللہ تعالیٰ تم سے وعدہ فرما رہا تھا کہ دو گروہوں (یعنی تجارتی قافلے اور قریش کے لشکر) میں سے ایک تمہارے ہاتھ آئے گا۔ اور تم چاہتے تھے کہ بے زور گروہ (یعنی تجارتی قافلہ) تمہیں ملے۔ حالانکہ اللہ چاہتا تھا کہ اپنے کلمات سے حق کو حق کر دکھائے اور کافروں کی کمر توڑ دے"۔

اس کے بعد آپ دریافت فرماتے ہیں کہ:۔

"کیا آپ سارے قرآن میں کسی آیت کی نشان دہی فرما سکتے ہیں کہ جس میں اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ نازل ہوا ہو کہ اے لوگو! جو مدینے سے بدر کی طرف جا رہے ہو ہم دو گروہوں میں سے ایک تمہیں قابو عطا فرمائیں گے۔؟"

اصولی طور پر یہ وہی تجلی وعدہ تھا جس کے مطابق خدا نے جماعتِ مومنین سے کہہ رکھا تھا کہ انھیں استخلاف فی الارض عطا کرے گا۔ خدا اور اس کا رسول کامیاب رہیں گے۔ غلبہ و تسلط حزب اللہ کا ہوگا۔ مومن اعلون ہوں گے۔ خدا کافروں کو مومنوں پر کبھی کامیابی نہیں دیگا۔ مجاہدین مخالفین کے اموال و املاک تک کے مالک ہوں گے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اور اس خاص واقعہ میں یہ "وعدہ" پیش افتادہ حالات والا رہے تھے۔ جن کی وضاحت قرآن کریم نے یہ کہکر کردی ہے کہ وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ (۸/۷) یعنی ان میں سے ایک گروہ بغیر ہتھیاروں کے تھا۔ اور اس پر غلبہ پانا یقینی نظر آتا تھا۔

میں یہ پہلے یہ وضاحت بتا چکا ہوں کہ جو باتیں طبعی قوانین کے مطابق ہوں خدا انھیں بھی اپنی طرف منسوب کرتا ہے۔ "یہ اللہ کا وعدہ" بھی اسی قبیل سے تھا۔ یعنی حالات بتا رہے تھے کہ ان دونوں میں سے ایک گروہ پر قابو پالینا یقینی ہے۔

آخری آیت

۳۔ آخری آیت آپ نے یہ پیش کی ہے کہ اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّىْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِيْنَ (۸/۹) "جب تم اپنے رب سے فریاد کرتے تھے تو اُس نے تمہاری فریاد کے جواب میں فرمایا میں تمھاری مدد کیلئے لگا تار ایک ہزار فرشتے بھیجنے والا ہوں"۔ اس کے بعد آپ پوچھتے ہیں کہ:۔

"کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسلمانوں کی فریاد کا یہ جواب قرآن کی کس آیت میں نازل ہوا تھا۔؟"

کیا میں آپ سے پوچھ سکتا ہوں کہ جب اللہ نے کہا کہ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ (۲/۱۸۶) "میں ہر پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں جب وہ پکارتا ہے" تو خدا کی طرف سے پکارنے والے کی پکار کا جواب کس نوشتے کے ذریعے ملتا ہے۔؟ جس طریق سے ہر پکارنے والے کو خدا کی طرف سے اُسکی پکار کا جواب ملتا ہے، اسی طریق سے جماعتِ مومنین کو ان کی پکار کا جواب ملا تھا۔ لیکن یہ جواب اُن لوگوں کو کسطرح نظر آسکتا ہے جو خدا کی ہر بات کو کاغذ پر تحریر شدہ دیکھنا چاہتے ہیں

کسے بتائے کوئی خونِ آرزو کیا ہے　　انھیں یہ ضد ہے کہ دیکھیں گے رنگ وبو کیا ہے

یہ ہیں وہ آیات جن سے آپ یہ بات ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ حضورؐ پر خدا کی طرف سے ایسی وحی بھی آیا کرتی تھی جو قرآن میں درج نہیں لیکن پیرویٔ رسول اللہ ناگزیر ہے۔ اے کاش! کبھی آپکو اسکا یقین ہوتا کہ ایک دن آپکو خدا کے سامنے بھی جانا ہے جہاں وہ پوچھے گا کہ تم کیوں وہ باتیں میری طرف منسوب کیا کرتے تھے جو میں نے نہیں کہی تھیں۔ اسکا جواب آپ کے پاس اس کے سوا اور کیا ہوگا کہ اگر میں ایسا نہ کرتا تو میری امارت قائم نہ رہتی۔

اور عجب وہ حق ہے جسکے سامنے جھکنے کا آپ مجھے حکم دیتے ہیں اور اگر میرا فہم قرآن مجھے اسکی اجازت نہیں دیتا تو پھر آپ گالیوں پر اتر آتے ہیں۔

فرار کی راہ

۴۔ میں نے یہ بھی پوچھا تھا کہ اگر قرآن کے ایک لفظ کی جگہ دوسرا لفظ رکھدیا جائے تو کیا اُسے بھی وحی منزل من اللہ کہا جائے گا۔؟ اور کیا وحی کے اُس دوسرے حصے کی بھی یہی کیفیت ہے؟۔ اس کا صحیح جواب دینے سے آپکی تمام دعاوی کی عمارت نیچے آگرتی تھی۔ اسلئے آپنے اسکا یہ جواب دیکر

"یہ ایسا مہمل سوال آپ نے کیا ہے کہ میں کسی پڑھے لکھے آدمی سے اسکی توقع نہیں کرسکتا تھا"

اہل علم اچھی طرح جانتے ہیں کہ میرا سوال کیا تھا اور اس سے آپ کس طرح پیچھا چھڑا کر بھاگ گئے ہیں۔ آپ نے آگے چل کر لکھا ہے کہ:۔

"وحی لازماً الفاظ کی صورت میں ہی نہیں ہوتی وہ ایک خیال کی شکل میں بھی ہو سکتی ہے جو دل میں ڈال دیا جائے"

وحی بلا الفاظ

آپکا دعویٰ تو بہت اونچا ہے اور معلوم اتنا بھی نہیں کہ یہ بات ممکنات میں سے نہیں کہ کسی شخص کے دل میں ایک خیال آئے اور اس کیلئے الفاظ نہ ہوں۔ نہ کوئی خیال الفاظ کے بغیر پیدا ہو سکتا ہے اور نہ کوئی لفظ بلا خیال کے وجود میں آسکتا ہے۔ ارباب علم سے پوچھئے کہ "وحی بلا الفاظ" کی مہمل ترکیب کا مطلب کیا ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ عربی زبان میں وحی کے معنی اشارہ لطیف کے ہیں۔ سوال "وحی" کے لغوی معنی کے متعلق نہیں۔ سوال اس اصطلاحی وحی سے متعلق ہے جو منجانب اللہ حضرات انبیاء کرام کو ملتی تھی۔ کیا اس وحی کے محض "لطیف اشارات" خدا کی طرف سے ہوتے تھے، یا الفاظ بھی مُنزّل من اللہ ہوتے تھے؟ اگر محض لطیف اشارات ہی ہوتے تھے تو اسکا مطلب یہ ہوا کہ قرآن کریم کے الفاظ حضورؐ کے اپنے تھے۔ کیا آپکا یہی ایمان ہے؟ اگر آپ کا یہ ایمان نہیں اور آپ سمجھتے ہیں کہ قرآن کریم بالفاظہٖ وحی منزل من اللہ ہے تو آپ وحی کو غیر متلو اور بلا الفاظ کیسے قرار دے سکتے ہیں؟ اور اگر وحی اس صورت میں وحی کہلا سکتی ہے جبکہ اسکے الفاظ محفوظ ہوں (جیسے قرآن کریم کے الفاظ کی حفاظت کا ذمہ خدا نے لے رکھا ہے) تو جس وحی کے الفاظ محفوظ نہ ہوں وہ وحی کیسے کہلا سکتی ہے؟ یاد رکھئے کہ یہ وحی متلو اور غیر متلو، اور جلی اور خفی کا فرق بہت بعد کا پیدا وار ہے۔ نہ خدا نے یہ فرق کیا ہے اور نہ ہی اس کے سچے رسولؐ نے۔ البتہ یہودی لٹریچر میں یہ اصطلاحات ملتی ہیں۔

حدیث کا انکار

(۵) میں نے یہ بھی پوچھا تھا کہ اگر کوئی شخص قرآن کی کسی آیت کے متعلق یہ کہدے کہ وہ منزل من اللہ نہیں تو وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص حدیث کے موجودہ مجموعوں میں سے کسی ایک کے متعلق یہ کہے کہ وہ خدا کی وحی نہیں تو کیا وہ بھی اسی طرح دائرۂ اسلام سے خارج ہو جائیگا؟ اسکے جواب میں آپ فرماتے ہیں کہ:-

"احادیث کے موجودہ مجموعوں سے جن سُنتوں کی شہادت ملتی ہے اُنکی دو بڑی قسمیں ہیں۔ ایک قسم کی سُنتیں وہ ہیں جن کے سُنت ہونے پر اُمت شروع سے آج تک متفق رہی ہے۔ یعنی بالفاظ دیگر وہ متواتر سُنتیں ہیں، اور اُمت کا ان پر اجماع ہے۔ ان میں سے کسی کو ماننے سے جو شخص بھی انکار کریگا وہ اُسی طرح دائرۂ اسلام سے خارج ہو جائیگا جس طرح قرآن کی کسی آیت کا انکار کرنیوالا خارج از اسلام ہوگا۔ دوسری قسم کی سُنتیں وہ ہیں جن کے ثبوت میں اختلاف ہے یا ہو سکتا ہے۔ اس قسم کی سُنتوں سے کسی کے متعلق اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میری تحقیق کے مطابق فلاں سُنت ثابت نہیں ہے اس لئے میں اُسے قبول نہیں کرتا تو اس قول سے اس کے ایمان پر قطعاً کوئی آنچ نہ آئے گی"۔ (ترجمان۔ دسمبر ۱۹۴۹ء صفحہ ...)۔

آپ اس سے پہلے یہ لکھ چکے ہیں کہ:-

"یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ جن چیزوں پر کفر و اسلام کا مدار ہے اور جن امور پر انسان کی نجات موقوف ہے انہیں بیان کرنیکا اللہ تعالیٰ نے خود ذمہ لیا ہے۔ وہ سب قرآن میں بیان کی گئی ہیں۔ اور قرآن میں بھی ان کو کچھ اشارتاً و کنایتاً نہیں بیان کیا گیا بلکہ پوری صراحت اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے کہ اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى"۔ (رسائل و مسائل صفحہ ...)

کیا آپ بتائیں گے اللہ تعالیٰ نے کس مقام پر یہ کہا ہے کہ جو شخص ان متواتر سُنتوں کے ماننے سے انکار کرے گا جن پر اُمت کا اجماع ہے وہ کافر ہو جائیگا اور جو ایسی سُنتوں سے انکار کریگا جن میں اختلاف ہے اُس کے ایمان پر حرف نہیں آئے گا۔؟ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں جو اجزائے ایمان گنائے ہیں (یعنی اللہ، اس کے رسول، اس کی کتب۔ ملائکہ اور آخرت) کیا ان میں کہیں بھی اس کا ذکر آیا ہے کہ اس فہرست میں وہ سُنتیں بھی شامل ہیں جو اُمت کے نزدیک متفق علیہ ہیں۔؟

ذرا سوچئے کہ کیا کفر و اسلام کا مدار بھی اُمت کے اتفاق اور اختلاف پر رکھا جا سکتا ہے۔ تعجب ہی نہیں تاسف ہے کہ آپ حضرات کس طرح خدا کے دین کو بچوں کا کھیل بنا رہے ہیں۔ آپ کو یہ بھی یاد رکھنا چاہئیے کہ آپ نے اسی اُمت کو جس کے اجماع کو آپ مدار ایمان قرار دے رہے ہیں "چڑیا گھر کے جانور" بتایا تھا۔ اس لحاظ سے آپ کے ارشاد کے مطابق انسان کی نجات کا دارومدار "چڑیا گھر کے جانوروں" کے اتفاق پر ہوگا۔

ایک بات اس ضمن میں اور بھی غور طلب ہے۔ آپ نے لکھا ہے کہ سُنتوں کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جن پر اُمت شروع سے آج تک متفق رہی، اور دوسری وہ جن میں اُمت کو اختلاف ہے۔ یہاں تک تو بات صاف ہے۔ اُمت کے عمل کی رُو سے (بقول آپ کے) سُنتیں دو قسموں میں تقسیم ہو چکی ہیں۔ ایک متفق علیہا اور دوسری مختلف فیہ ——— لیکن اس کے ساتھ ہی آپ فرماتے ہیں کہ جن سُنتوں میں اختلاف ہو سکتا ہے

وہ بھی دوسری قسم میں شامل ہیں۔ کیا آپ بتائیں گے کہ یہ اختلاف سُنتوں کی دونوں قسموں میں سے کس قسم میں ہو سکتا ہے؟ جن سُنتوں میں پہلے سے اختلاف چلا آ رہا ہے اُن میں "اختلاف ہو سکنے" کے تو کچھ معنی ہی نہیں۔ ان میں تو اختلاف موجود ہے۔ مزید اختلاف کا سوال اُنہیں سُنتوں میں پیدا ہو سکتا ہے جو متفق علیہ ہیں۔

اس سے ظاہر ہے کہ آپ متفق علیہ سُنتوں میں بھی اختلاف کے امکان کے قائل ہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی آپ یہ بھی فرماتے ہیں کہ جو ان سُنتوں میں سے کسی ایک کا انکار کرے وہ کافر ہو جاتا ہے۔

عرفِ آخر مجھے اس خط کو اب ختم کر دینا چاہیئے، ورنہ لکھنے کو تو ابھی بہت کچھ اور لکھا جا سکتا ہے۔ آپ ایک بار پھر میرے سوالات پر غور کریں اور سوچیں کہ سوال کیا تھے، اور اُن کے جوابات آپ نے کیا دیئے؟ میں صرف متعین طور پر یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ جس طرح جب ہم "قرآن" کہتے ہیں تو اس سے دنیا کے ہر مسلم (بلکہ غیر مسلم تک) کے ذہن میں واضح، غیر مبہم اور متعین تصور آ جاتا ہے کہ اس سے ہماری مراد کیا ہے۔ اور جب ہم عربی زبان کا کوئی فقرہ بولیں تو ہر شخص خواہ وہ دنیا کے کسی حصے میں کیوں نہ ہو، بلا تأمل و تردد بتا سکتا ہے کہ وہ قرآن کی آیت ہے یا نہیں۔ کیا اسی طرح "سُنّت" کی بھی کیفیت ہے۔؟ یہ تھا میرا سوال۔ آپ کسی غیر جانبدار سے پُوچھیئے کہ جس قدر طومار آپ نے لکھ ڈالا ہے کیا اُس سے میرے اس سوال کا جواب مل جاتا ہے؟

میں آپ کی تحریروں سے جو کچھ اخذ کر سکا ہوں وہ یہ ہے کہ دل میں آپ بھی اسے تسلیم کرتے ہیں کہ سُنّت کی پوزیشن نہیں لیکن اسکے اعتراف کی جرأت اپنے اندر نہیں پاتے۔ اور اپنی اس کمزوری کو طویل نویسی، طعن و تشنیع، استہزاء و استخفاف اور ابتذال اور بازاریت کے گھناؤنے پردوں میں چھپانے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔

میرا مسلک نہ انکارِ سُنّت ہے اور نہ میں نے پہلے سے کچھ فیصلہ کر کے آپ کی طرف رجوع کیا تھا۔ میرا مقصد تحقیقِ حق تھا۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ کے جوابات میرے لئے اور الجھاؤ کا باعث بن گئے۔ مجھے اپنی تو فکر نہیں، اس لئے کہ اس قسم کے اُلجھاؤ سے میرے ایمان پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔ لیکن مجھے اُن سادہ لوح مسلمانوں کی حالت پر ترس آتا ہے جو آپ کے دامِ تزویر کا شکار ہو کر باطل کو حق سمجھنے لگتے ہیں۔

براہِ کرم میرے اس خط کو ترجمان القرآن کی قریبی اشاعت میں شائع فرما دیجئے تاکہ اُس کے قارئین تصویر کا دوسرا رُخ بھی دیکھ سکیں۔ لیکن اگر آپ اپنے میں اس کی اشاعت کی ہمت نہ پائیں تو مجھے مطلع فرما دیں، تاکہ میں اس کی اشاعت کے لئے کوئی اور طریقہ اختیار کر سکوں۔ مجھے آپ کے جواب کا انتظار رہے گا۔

مجھے افسوس ہے کہ اس خط میں مجھے بعض مقامات پر اپنے انداز سے ہٹ کر گفتگو کرنی پڑی۔ یہ اس لئے کہ میں اس حقیقت سے باخبر ہوں کہ جو شخص جس زبان میں بات کرے وہ دوسرے کی بات کو نہیں سمجھ سکتا جب تک اُس سے اُس کی زبان میں گفتگو نہ کی جائے۔

والسلام

ایک سلیم بیٹے کا خط

پیارے ابا جان!

آپ کو تعجب ہوگا کہ آپ کا اپنا بیٹا، تو کوئی نہیں پھر آپ سے اس انداز میں کون خطاب کر رہا ہے۔ یقین جانیئے کہ قوم کے ہزاروں "سلیم" آپ کے بیٹے ہیں (میں ان میں سے ایک ہوں) آپ کے یہ وہ بیٹے ہیں جنہیں آپ نے قرآن حکیم کی ہوش ربا تعلیمات سے روشناس کر دیا ہے۔ جنہیں یقین ہو گیا ہے کہ قرآن حکیم ایک زندہ کتاب ہے جس میں وہ تابندہ اصول مرقوم ہیں جن کی اطاعت اس کرۂ ارض کو بہشت میں بدل دے گی۔ وہ وقت عنقریب آنے والا ہے جب یہ "سلیم" وہ انقلاب برپا کریں گے جسے آسمان کی آنکھ نے آج سے تقریباً تیرہ سو برس پیشتر چند لمحوں کے لئے دیکھا تھا۔

فروری کے طلوعِ اسلام میں میری ایک "طاہرہ" بہن نے آپ کی طرف خط لکھا ہے جسے میں نے بھی نہایت غور سے پڑھا ہے۔ اور آپ کا جواب بھی۔ "طاہرہ بہن" کے لئے پہلے ہی میرے دل میں بے حد وقعت اور پیار ہے۔ مجھے ہر وقت اُس کا خیال رہتا ہے۔ لیکن اُس کا خط پڑھ کر میری راتوں کی نیند حرام ہو گئی۔ ہر وقت اس سوچ میں رہتا ہوں کہ اس معاشرہ کو کس قدر جلدی سے جلدی بدل دوں جس میں وہ نہ صرف انتہائی عزت و وقار سے پرسکون زندگی بسر کرے بلکہ وہ اپنی تمام صلاحیتوں کو تخلیق و تعمیرِ انسانیت کے بلند مقاصد کے حصول کے لئے پوری طرح عمل میں لا سکے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ آپ نے اپنے جواب میں اس عمدگی سے لکھ دیا ہے کہ جی چاہتا ہے کہ آپ پاس ہوں تو بے حد پیار کروں۔

قوم کے تمام "سلیم" بیٹوں اور "طاہرہ" بیٹیوں کو اس تعلیم کی ضرورت ہے جو اُن میں وہ نفسیاتی تبدیلی پیدا کرے جس سے سوچنے کا انداز ہی بدل جائے۔

مجھے "طاہرہ بہن" سے کافی حد تک اتفاق ہے۔ لیکن اس کی ایک دو باتیں درست معلوم نہیں ہوتیں۔ اُس نے لکھا ہے کہ یہ اس کا ذاتی تجربہ ہے۔ اور اپنی سہیلیوں کے حالات کا گہرا مشاہدہ کرنے کا نتیجہ بھی ہے کہ

مرد کے دل میں عورت پر تغلب (Domination) کرنے کا جذبہ موجود ہے۔ اور اگر خاوند بیوی کی عزت کرتا ہے تو محض فیشن اور بناوٹی ہوتی ہے۔ وہ خاوند کی انیؔو (EGO) کی تسکین ہوتی ہے۔ خاوند بیوی کو دبوچ کر ستانے میں لذت لیتا ہے۔" طاہرہ" بہن کے ان الفاظ نے مجھے سخت رنج پہنچایا ہے۔ لیکن مجھے غصہ نہیں آیا۔ میں اُسے محض سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں۔

میری شادی ہوئے کئی سال گذر چکے ہیں۔ میں خود بھی ایم۔اے ہوں۔ میری بیوی بھی ایم۔اے ہے۔ ہمارے ہاں ایک لڑکا اور دو لڑکیاں ہیں۔ ازدواجی زندگی کے اس عرصہ میں تلخ کلامی تو درکنار، ہمارے دل میں ایک دوسرے کے خلاف غصے کے مہین جذبات بھی رونما نہیں ہوئے۔ ہم ایک دوسرے کے جذبات اور خیالات کو پوری طرح سمجھتے ہیں۔ ہم میں تغلب (Domination) کا کبھی تصور بھی پیدا نہیں ہوا۔ میں جب دفتر سے فارغ ہوتا ہوں تو جلدی سے جلدی گھر پہنچنے کی کوشش کرتا ہوں۔ جہاں میری بیوی بے چینی سے میرا انتظار کرتی ہوتی ہے۔ اور نہایت خندہ پیشانی سے میرا استقبال کرتی ہے۔ ہم ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔ اور ہم دونوں یہ سوچ کر بے حد خوش ہوتے ہیں کہ اس شادی نے ہماری زندگیوں کے خلا کو انتہائی اطمینان بخش طریقے سے پُر کر دیا ہے۔ اور زندگی کو بے حد خوشگوار بنا دیا ہے۔ یقین جانئے ہمارا گھر امن کا گہوارہ ہے۔ اس کا سہرا میری بیوی کے سر ہے جو ایم۔اے ہونے کے باوجود گھر کے چھوٹے سے چھوٹے کام کو نہایت سلیقہ شعاری سے سرانجام دیتی ہے۔ اعلیٰ تعلیم نے میری بیوی کے مزاج میں وہ شیرینی پیدا کر دی ہے جس نے زندگی کی خوشگواریوں کو دوبالا کر دیا ہے۔ ہم دونوں مل کر گھنٹوں سوچ بچار کرتے رہتے ہیں کہ کسی طرح جلد سے جلد وہ انقلاب آئے جو نوعِ انسانی کو تمام قیود سے آزاد کر کے محض قانونِ خداوندی کا مطیع کر دے۔ ہماری ہم آہنگیٔ خیالات ہماری متاعِ عزیز ترین ہے جس کی وجہ سے گھر جنت ہے۔

میرے بے شمار دوست ایسے ہیں جن کی ازدواجی زندگیاں بے حد خوشگوار ہیں جو اپنی بیویوں کو رفیق و مونس سمجھتے ہیں اور جو تغلب (Domination) کے تصور سے بالکل ناآشنا ہیں۔ (یہ میرا گہرا اور صحیح مشاہدہ ہے) بلکہ بعض تو ایسے ہیں جنھیں دوسرے دوست کہتے ہیں کہ "تم تو بیوی کے غلام ہو۔"

میرے ایک دوست ہیں جو اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں جن کا مطالعہ کافی وسیع ہے اور دماغی طور پر انتہائی ذہین۔ وہ شادی کرنے کا ارادہ کر رہے ہیں۔ میرے استفسار پر کہ وہ کس قسم کی شادی کرنا چاہتے ہیں انھوں نے جو جواب دیئے۔ وہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ (ایسا کرنے سے میرا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ "کیسی شادی کروں گا" کا ایک عنوان قائم کروں۔ بلکہ صرف یہ کہ چونکہ ہر "طاہرہ" کو ہر "سلیم" سے واسطہ پڑنے کا امکان ہو سکتا ہے۔ لہٰذا ایک "سلیم" کے خیالات "طاہرہ" بہنوں کو پیش کر دوں)

مجھے سب سے عزیز گھریلو امن ہے۔ میری بیوی بے شک ایم۔ اے نہ ہو لیکن سلیقہ شعار و معاملہ فہم (Considerate) ضرور ہو۔ اس کے دماغی حسن کو اس کے چہرے کے حسن پر ترجیح دوں گا۔ اس کی "بلند نصبی" کو اس کی ذاتی صفات پر ترجیح دوں گا۔ مجھے جہیز کی بالکل ضرورت نہیں۔ لیکن بیوی ایسی نہیں ہونی چاہیئے جو اپنی والدین کی امارت کے افسانے ہی سناتی رہے۔ بیوی ایسی نہیں ہونی چاہیئے جو گھر میں تو "بور" ہو اور ہر شام کم از کم دو گھنٹے مال روڈ پر شیزان کے سامنے ٹہل کر وہاں کی رونق میں اضافہ کرنا اپنا فرض سمجھے۔ اور جس کی چائے نوشی کی تسکین صرف دستارلان کی چائے سے ہو، جو..... کے کسی پروگرام پر نہ جا سکنے کو ناقابل تلافی نقصان سمجھے اور ہر انگریزی فلم کو سب سے پہلے دیکھنا فرض (فیشن نہیں) سمجھے۔"

معاف کیجئے کہ میں نے اپنے دوست کے فرینک الفاظ آپ کے سامنے رکھ دیئے لیکن یہ الفاظ آپ کے ہر "سلیم" بیٹے کے خیالات کی ترجمانی کرتے نظر آ رہے ہیں۔

آپ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ تھوڑے سے باہمی تعاون اور سمجھ سے ایغو (EGO) کی تسکین اور تغلب (Domination) کا مسئلہ بالکل غائب ہو سکتا ہے اور ہر "طاہرہ" کا گھر امن کا گہوارہ بن سکتا ہے۔ طاہرہ بہن سے میری درخواست ہے کہ اس معاملہ پر اس طرح بھی غور کریں۔

آپ نے ہمیں قرآن کے دیئے ہوئے "مقام انسانیت" سے واقف کر دیا۔ آپ کی قرآنی تعلیم نے ہماری نگاہوں میں روشنی پیدا کی اور ہمیں مرد اور عورت کے مدارج و حقوق سے روشناس کر دیا۔

خدا آپ کو قیامت تک زندگی بخشے۔

آپ کا بیٹا "سلیم"

یہ خط لکھنے کے بعد "ایک اور طاہرہ بہن" کا خط میری نظر سے مارچ کے طلوع اسلام میں گزرا۔ اس کا جواب بھی خاص کر (SEXUAL) لغزش میں عورت ہی کیوں مورد الزام ٹھیرائی جاتی ہے" پر لکھنے کو جی چاہتا ہے۔ لیکن پھر کبھی۔

"سلیم"

سلیم میاں!

اللہ تمہیں خوش رکھے۔ تمہاری زندگی کو اور خوش گوار بنائے اور تمہارے عزائم میں برکت اور تصورات کو مزید درخشندگی عطا کرے۔ مجھے یہ معلوم کر کے بڑی خوشی ہوئی کہ تمہاری گھر کی زندگی اس قدر پُرامن اطمینان بخش ہے۔ میری طرف سے میری طاہرہ بیٹی (اپنی بیوی) کو دلی مبارکباد کہنا۔

"طاہرہ بیٹی" نے مرد کے جس تغلب کا ذکر کیا تھا اس سے وہ مرد مراد ہیں جو "حیوانی سطح" پر زندگی

بسر کرتے ہیں اور جنھیں زندگی کی بلند اقدار سے کوئی واسطہ نہیں۔ اور تم نے جن مردوں کا ذکر کیا ہے وہ، وہ ہیں جن کی نگاہوں کا زاویہ قرآنی اقدار نے بدل دیا ہے۔ اس لئے دونوں باتیں اپنی جگہ پر درست ہیں۔ اس "طاہرہ بیٹی" کے علم و مشاہدہ میں ابھی تک کوئی ایسا گھر نہیں آیا ہوگا جسے قرآنی تصورات نے رشکِ فردوس بنا رکھا ہو۔

پرویز

لغات القرآن کی چوتھی اور آخری جلد بھی شائع ہوگئی

اس کے ساتھ ایک مفصل تتمہ بھی ہے جس میں چاروں جلدوں پر نظرِ ثانی کے بعد، بہت سے مفید اضافے، ضروری ترمیمات اور غلطیوں کی تصحیح کی گئی ہے۔ اب یہ لغات مکمل ہوگئی ہے۔ اس لئے آپ اپنی فرمائش بہت جلد بھیجدیں۔

۲۔ لغات القرآن کے بعد اگلا مرحلہ

مفہوم القرآن کا ہے

اس میں الحمد سے والناس تک، قرآن کریم کا مسلسل مفہوم، ایک مربوط کتاب کی شکل میں سامنے آجائیگا لغات اور مفہوم القرآن کے بعد، قرآن کریم کے سمجھنے میں آپ کی کوئی دقت باقی نہیں رہے گی۔

مفہوم القرآن کے نمونے کے چند ورق چھاپ دیئے گئے ہیں۔ اس سے آپ اندازہ لگا سکیں گے کہ یہ کس قسم کی کوشش ہے ــــ لغات القرآن جلد چہارم کے ساتھ مفہوم القرآن کے نمونے کے صفحات بلا قیمت بھیجے جائیں گے۔

میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ

۲۷۔ بی ــ شاہ عالم مارکیٹ ــ لاہور

تیسری "طاہرہ بیٹی" کا خط

آپ نے طلوعِ اسلام (بابت فروری) میں جس لڑکی کا خط شائع کیا ہے اس میں یہ پوچھا گیا ہے کہ جو لڑکیاں خود کماتی ہیں ان کی زندگی خوشی کی گزرتی ہے یا نہیں۔ میں یہ خط اسی سلسلہ میں لکھ رہی ہوں۔ میں لیڈی ڈاکٹر ہوں اور سائنس پڑھتی رہی ہوں اس لئے میں ایسا اچھا خط نہیں لکھ سکوں گی جیسا اس بہن نے لکھا ہے۔ لیکن طلوعِ اسلام سے مجھے شروع سے دلچسپی رہی ہے اس لئے کوشش کروں گی کہ اپنے خیالات کو واضح کر سکوں۔

کوئی دس سال کا عرصہ ہوا جب میں نے ڈاکٹری کا امتحان پاس کیا ہم اپنی کلاس میں چار گہری سہیلیاں تھیں۔ ہمارے خیالات عام لڑکیوں جیسے نہیں تھے۔ ہم جب بھی آپس میں بیٹھتیں، ہمیشہ یہ باتیں کرتیں کہ ہم اپنی زندگی غریبوں کے علاج کے لئے وقف کر دیں گی۔ اس کے لئے ہم طرح طرح کے پروگرام بناتیں۔ شادی کرنے کا ہم میں سے کسی کا بھی خیال نہیں تھا۔ آخری سال کا ذکر ہے کہ ہمارے ایک پروفیسر صاحب نے ایک دن بہت دھواں دار لیکچر دیا کہ لڑکیوں کو یہ خیال بالکل چھوڑ دینا چاہیئے کہ وہ شادی نہیں کریں گی۔ عورت شادی کے بغیر بالکل نہیں رہ سکتی۔ اس کا چال چلن کبھی ٹھیک نہیں رہ سکتا۔ اسے بے شمار قسم کی بیماریاں لگ جاتی ہیں۔ ایک تو لڑکیوں کے لئے استاد کی بات ویسے ہی سند ہوتی ہے۔ دوسرے انہوں نے ہمیں کچھ ایسا ڈرایا کہ ہم دل ہی دل کانپ اٹھیں۔ وہ شام ہمارے لئے بڑی قیامت کی تھی۔ ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ اگر لڑکیاں شادی کے بغیر زندگی نہیں گزار سکتیں تو ہمیں اتنے سال ڈاکٹری کیوں پڑھائی گئی ہے۔ ہم میں سے دو سہیلیوں نے اپنا پچھلا خیال ترک کر دیا اور فیصلہ کر لیا کہ شادی کریں گی۔ اور اس کے ساتھ ہی ڈاکٹری بھی کریں گی۔ مجھے ڈاکٹری بہت عزیز تھی اور میں محسوس کرتی تھی کہ شادی کرنے کے بعد میرا یہ پروگرام باقی نہیں رہ سکے گا اس لئے میں اپنے خیال پر جمی رہی۔ اسی طرح ہماری چوتھی سہیلی بھی۔ وہ دو سہیلیاں جنہوں نے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا ہمارے لئے مصیبت بن گئیں اب وہ ہر روز ہم سے اسی بات پر بحث کیا کرتی تھیں اور ہمیں طرح طرح سے ڈرایا کرتی تھیں کہ شادی نہ کرنے سے ہماری کیا حالت ہو جائے گی۔ ان میں سے ایک لڑکی نے

اسی زمانے میں ایک لڑکے سے شادی کرنے کا فیصلہ بھی کر لیا جو ہمارے ساتھ ہی فائنل کلاس میں پڑھتا تھا۔ وہ بہت خوش تھی کہ بیوی بھی ڈاکٹر ہوگی اور خاوند بھی ڈاکٹر اور دونوں کی زندگی بہت اچھی گزرے گی۔ شروع شروع میں ان کی زندگی واقعی بہت اچھی گزری۔ دونوں پریکٹس کرتے تھے۔ بہت آمدنی تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ ان کی زندگی تلخ ہونے لگی۔ بات واضح تھی۔ میاں بیوی دونوں کلینک میں رہتے۔ گھر نوکروں کے سپرد ہوتا۔ ان کا گھر (Home) نہیں تھا۔ ہوٹل تھا۔ اور ہوٹل بھی ایسا جس کا کوئی مینیجر نہ ہو۔ اس میں سب بیرے خانساماں ہوں۔ مرد کی فطرتی خواہش ہوتی ہے کہ وہ شام کو گھر آئے تو اسے وہاں (Home) کا آرام اور سکون ملے۔ لیکن اس گھر میں وہ آرام اور سکون تو ایک طرف صحیح انتظام بھی نہیں ملتا تھا۔ اب ان میں آئے دن بک بک جھک جھک شروع ہوئی۔ کچھ عرصہ کے بعد (Compromise) ہوا کہ بیوی نے آدھے دن کا کلینک کر دیا۔ لیکن اس کے بعد ان کے ہاں دو تین بچے ہو گئے۔ اب ان کی دیکھ بھال ضروری ہو گئی۔ جب ماں کلینک میں جاتی تو بچے نوکروں کے سپرد ہوتے۔ ہمارے ہاں کے نوکر جس طرح بچوں کی تربیت کر سکتے ہیں وہ ظاہر ہے۔ اب ہر شام میاں بیوی میں یہ جھگڑا رہتا۔ بیوی کہتی کہ بچوں کی تربیت باپ کا کام ہے۔ خاوند کہتا کہ میرا کام روزی کمانا ہے۔ بچوں کی دیکھ بھال تمہارا کام ہے۔ دو سال کی بک بک کے بعد بالآخر بیوی کو کلینک چھوڑنا پڑا۔ لیکن چونکہ اس کا احساس یہ تھا کہ اس پر ظلم کیا گیا ہے اس لئے اسے خاوند کے خلاف مستقل شکایت تھی۔ ادھر خاوند کو یہ شکایت تھی کہ جس قدر گھر میں خرچ ہوتا ہے اس کے مقابلہ میں انتظام اور آرام خاک بھی نہیں۔ وہ ہمیشہ یہ کہتا کہ فلاں عورت کو دیکھو کہ وہ اتنی کم آمدنی میں کس سلیقے سے گھر چلا رہی ہے۔ وہ یہ بھول جاتا کہ وہ عورت ساری عمر (House - wife) رہی ہے اور اس کی بیوی ساری عمر ڈاکٹر رہی ہے۔ لیکن وہ بھی سچا تھا۔ وہ بیوی کو بیوی دیکھنا چاہتا تھا۔ کبھی کبھی ہماری یہ سہیلی ملتی ہے تو خاوند کے خلاف مسلسل شکایت کا دفتر کھول کر اپنا غصہ نکال لیتی ہے۔ اور پھر جب وہ میری حالت دیکھتی ہے تو اسے صبر آ جاتا ہے۔

دوسری لڑکی کی شادی اس کے ماں باپ نے اپنے رشتہ داروں میں کی۔ لڑکا فوج میں انجینئر تھا۔ ویسے بھی خاندان امیر تھا۔ شادی سے پہلے لڑکا اس پر رضامند تھا کہ اس کی بیوی اپنا پروفیشن جاری رکھے۔ چنانچہ پہلے اس کی بیوی نے سروس اختیار کی تھوڑے ہی دنوں بعد اس کے خاوند کی تبدیلی دوسری جگہ ہو گئی۔ اب میاں کہیں تھا۔ بیوی کہیں۔ اس کے بعد فیصلہ ہوا کہ وہ سروس چھوڑ کر پرائیویٹ پریکٹس کرے۔ لیکن پریکٹس جمنے میں دو چار چھ مہینے لگ جاتے ہیں۔ ہوتا یہ کہ جونہی اس کی پریکٹس کامیاب ہونے لگتی، اس کے خاوند کی تبدیلی ہو جاتی۔ وہ کچھ عرصہ پیچھے رہتی لیکن پھر وہیں جانا پڑتا۔ یہ لڑکی سمجھدار تھی۔ اس لئے اس نے جب دیکھا کہ یہ دونوں باتیں ساتھ نہیں چل سکتیں تو اس نے پروفیشن چھوڑ دیا۔ چھوڑنے کو تو چھوڑ دیا لیکن اس کا اسے صدمہ اتنا ہے کہ وہ اسے کبھی بھولتی نہیں۔ بہرحال، اس کی پڑھائی کی محنت اور ڈاکٹری وغیرہ سب گئی۔

اب مجھ بدنصیب کی داستان سنئے۔ میں اپنی کہانی زیادہ تفصیل سے نہیں سنانا چاہتی۔ اس لئے کہ میں بھری بیٹھی ہوں۔ معلوم نہیں کیا کیا کہہ دوں گی۔ میرا دل رونے کو ہی نہیں چیخنے کو چاہتا ہے۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ میں شادی نہیں کروں گی اور اپنی زندگی پروفیشن میں گزاروں گی اور غریبوں کی خدمت کروں گی۔ گھر میں میری والدہ سوتیلی تھیں۔ میرا حقیقی بھائی بہن کوئی نہیں تھا۔ سوتیلے تھے۔ والد صاحب کی پہلے تو طبیعت اور قسم کی ہوتی تھی لیکن امی جان کی وفات کے بعد اس دوسری شادی کے ساتھ ان میں بہت تبدیلی آ گئی۔ میں صرف اتنا کہوں گی کہ میں اس گھر میں تو رہتی تھی لیکن ایک ایسے قیدی کی طرح جس سے دن بھر کام لیا جائے اور کھانے کو مٹی ملا آٹا دیا جائے۔ میں بڑی محنت سے پریکٹس کرتی۔ لیکن والد صاحب کی سخت گیری کا یہ عالم تھا کہ وہ پائی پائی کا حساب لیتے۔ اگر میں کسی غریب بیمار سے کم پیسے لیتی تو بھی میری شامت آجاتی۔ میں نے کبھی سوچا تھا کہ کچھ روپے جمع کر کے اعلیٰ تعلیم کے لئے ولایت چلی جاؤں گی۔ لیکن میری آمدنی میں سے میرے حصے میں گھر کی روٹی۔ ان کی پسند کے کپڑے اور معمولی اخراجات کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ باپ کی سخت گیری اور سوتیلی ماں اس موقع کی تلاش میں رہتی کہ مجھے کسی نہ کسی طرح بدنام کرے یہ سب اس لئے تھا کہ انہیں معلوم تھا کہ میرے لئے رہنے کی اور کوئی جگہ نہیں۔ میں شاید تنہا رہنے کا کچھ انتظام کر لیتی لیکن ایک تو والد صاحب کی بدنامی کا ڈر تھا دوسرے سوتیلی ماں کی طرف سے اپنی بدنامی کا بھی ڈر۔ میں نے سات آٹھ سال اسی عذاب میں اس امید پر گزار لئے کہ شاید حالات ٹھیک ہو جائیں۔ بالآخر میں نے تنگ آکر فیصلہ کر لیا کہ مجھے شادی کر لینی چاہیئے۔ اب میری عمر اتنی زیادہ ہو چکی تھی کہ مجھے یا تو ایسا خاوند مل سکتا تھا جو دوسری شادی کرنا چاہے۔ یا (WIDOWER) ہو۔ میں ان زمانے میں ہسپتال میں کام کیا کرتی تھی۔ اسپیشل وارڈ میں ایک مریض آیا۔ اس نے مجھے اپنی طرف کھینچنا شروع کیا۔ (بعد میں معلوم ہوا کہ وہ آیا ہی اس غرض سے تھا)۔ کچھ اس نے غلط بیانی سے کام لیا۔ کچھ میں نے اپنی مجبوری کے ماتحت، اپنے آپ کو دھوکے میں رکھا۔ ہماری شادی ہو گئی۔ اب حالت یہ ہے کہ وہ بیکار ہیں۔ ان کے پہلی بیوی سے تین بچے ہیں۔ اور میں ان کے لئے سونے کے انڈے دینے والی مرغی ہوں۔ سوچتی ہوں کہ باپ کے گھر کی سختی سے تنگ آکر یہاں پہنچی تھی۔ اب یہاں سے تنگ آکر کہاں جاؤں؟

ہماری چوتھی سہیلی البتہ بڑی خوش نصیب نکلیں۔ اس کے والد (اللہ ان کو سلامت رکھے) بہت عمدہ آدمی ہیں۔ وہ اس کے والد نہیں ان کی سہیلیوں کے بھی والد ہیں۔ مجھے طلوع اسلام سے دلچسپی انہی کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی۔ ان کی بیٹی نے جب امتحان پاس کیا تو انہوں نے ایک مخلص دوست کی طرح مستقبل کے تمام حالات اس کے سامنے اچھی طرح رکھ دیئے۔ اسے بتا دیا کہ شادی کرنے میں یہ بات ہو گی اور نہ کرنے میں یہ صورت۔ پھر اسے اجازت دی کہ وہ اچھی طرح غور کر کے اپنے لئے فیصلہ کرے۔ اس پر کسی قسم کا جبر نہیں ہو گا۔ وہ اپنے پہلے فیصلے پر قائم رہی اور پریکٹس شروع کر دی۔ اباجی نے (ہم سب انہیں اباجی کہتے ہیں) کلینک کی منیجری سنبھال لی۔ انہوں نے

اپنا فریضہ یہ سمجھ لیا کہ بیٹی کو کس طرح آرام اور سہولتیں پہنچائی جائیں۔ جو بات سامنے آتی، باپ اور بیٹی دوستوں کی طرح آپس میں مشورہ کرتے کسی بات میں اختلاف ہو جاتا تو ہنسی خوشی سے اس کا حل نکال لیتے۔ اس سکون اور اطمینان اور اچھے انتظامات کا نتیجہ یہ تھا کہ چند ہی دنوں میں اس کی پریکٹس بہت بڑھ گئی۔ وہ غریبوں کے ساتھ بیحد ہمدردی کرتی تھی جس کی وجہ سے گھر گھر سے دعائیں ملتی تھیں۔ وہ اسکولوں میں بچیوں کے معائنہ کرنے کو جاتی تھی تو وہ خوشی سے اچھلنے لگ جاتی تھیں کہ آپا جی آگئیں۔ اس کے بلند خیالات اور پاکیزہ زندگی کا نتیجہ یہ تھا کہ چھوٹے بڑے سب اس کی تعظیم کرتے تھے۔ پانچ چھ سال میں اپا جی نے اسی کی (EARNING) سے اتنا جمع کر لیا کہ اعلیٰ تعلیم کے لئے اسے ولایت بھیج دیا۔ اب وہ عنقریب واپس آنے والی ہے۔ ایک میڈیکل کالج سے اسے پروفیسری کی آفر بھی ہو گئی ہے۔ اس نے مجھے اپنے خط میں لکھا ہے کہ میں اس آفر کو ضرور قبول کر لوں گی۔ اس لئے کہ اس سے مجھے موقعہ مل جائے گا کہ میں لڑکیوں کے خیالات کی اس طرح اصلاح کر سکوں کہ وہ نہایت پاکیزہ زندگی گزارتے ہوئے انسانیت کی خدمت کے لئے اپنے آپ کو وقف کر سکیں۔ وہ واپسی پر آپ کو ضرور ملیں گی۔ اس دوران میں اباجی کوشش کر رہے ہیں کہ ان کے کلینک کو غریبوں کے علاج کے لئے وقف کر دیا جائے اور امید ہے کہ وہ ضرور اس بارے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ میرا بہت جی چاہتا ہے کہ جب ایسا ہو جائے تو میں بھی اپنی سہیلی کے ساتھ مل جاؤں — لیکن مجھے اب اس کی اجازت کون دے گا؟ آف۔ انسان بھی کس قدر مجبور ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اُسے خدا نے صاحب اختیار اور ارادہ پیدا کیا ہے لیکن ہماری سوسائٹی کی مجبوریاں اس کی اس طرح ہڈیاں توڑ دیتی ہیں کہ خدا کا دیا ہوا اختیار اور ارادہ اس کے کسی کام نہیں آسکتا — اب میں بس کرتی ہوں کیونکہ مجھے ڈر ہے کہ کچھ اور نہ کہہ بیٹھوں۔

آخر میں میں، اپنی ناکام زندگی کے تجربے کی بنا پر کچھ باتیں بطور مشورہ لکھنا چاہتی ہوں تاکہ اور لڑکیاں جو ہمارے پیچھے پیچھے آرہی ہیں ان سے فائدہ اٹھائیں۔

(۱) ہمارے معاشرہ میں ڈاکٹری پروفیشن اور شادی کی زندگی دونوں اکٹھے نہیں چل سکتے۔ جو ماں باپ اپنی لڑکیوں کو میڈیکل کی تعلیم دلانا چاہیں انھیں چاہیئے کہ اس کی بابت پہلے سوچ لیا کریں۔

(۲) کالج میں داخلہ کے وقت لڑکیوں میں اتنی پختگی نہیں ہوتی کہ وہ اپنے مستقبل کے متعلق سوچ سکیں جب وہ امتحان پاس کر لیں تو انھیں پروفیشن اور شادی کی زندگی کے متعلق سب کچھ سمجھا دینا چاہیئے اور انھیں اس کی اجازت دیدینا چاہیئے کہ وہ جس وقت بھی چاہیں وہ پروفیشن کا خیال چھوڑ کر شادی کی زندگی اختیار کر لیں۔ اس پر انھیں قطعاً ملامت نہیں کرنی چاہیئے۔

(۳) کالج میں لڑکے اور لڑکیوں کی تعلیم مخلوط بالکل نہیں ہونی چاہیئے۔ میڈیکل کالج میں تو ہرگز ہرگز نہیں ہونی چاہیئے (اس کی وجہ ظاہر ہے۔)

(۴) میڈیکل کالج میں صرف عورتیں پروفیسر ہونی چاہئیں۔ مرد بالکل نہیں ہونے چاہئیں۔

(۵) پروفیسروں کو صرف (FACTS) کی تعلیم دینی چاہیئے۔ اپنے جذبات کو درمیان میں نہیں لانا چاہیئے۔ ہمارے پروفیسر صاحب نے شادی کے متعلق جو لیکچر دیا تھا اور جس نے لڑکیوں کی زندگی کا رُخ موڑ دیا۔ وہ (FACTS) پر مبنی نہیں تھا۔ محض ان کے جذبات کا اثر تھا۔ مجھے بعد کے کافی مطالعہ اور عملی زندگی کے تجربہ نے اس نتیجہ پر پہنچایا ہے کہ (SEX) واقعی کوئی ہوا نہیں جس پر قابو نہ پایا جا سکے۔ آپ کی ریسرچ بالکل صحیح ہے کہ یہ محض (PSYCHOLOGICAL IMPULSE) ہے جو خیالات کے ماتحت رہتی ہے۔ پاکیزہ خیالات رہیں تو اس کا کچھ اثر نہیں ہوتا۔ نہ ہی اس سے کسی قسم کی بیماریاں لگتی ہیں۔ یہ خواہ مخواہ کے پھیلائے ہوئے وہم ہیں۔ اس کی ذمہ دار ہماری کچھ لیڈی ڈاکٹر بھی ہیں یہ کسی وجہ سے شادی ضرور کرنا چاہتی ہیں لیکن چونکہ پہلے کلاس میں یہ کہہ چکی ہوتی ہیں کہ ہم پروفیشن کو کبھی بھی شادی پر قربان نہیں کریں گی اس لئے اب وہ شادی کا نام لینے سے اپنی سہیلیوں میں شرماتی سی ہیں۔ بات تو یہ ہوتی ہے لیکن اس کے لئے کہنا یہ شروع کر دیتی ہیں کہ اب ہمیں معلوم ہوا ہے کہ عورت شادی کے بغیر زندگی نہیں گزار سکتی۔ اسے طرح طرح کی بیماریاں لگ جاتی ہیں۔ میں اپنی اس قسم کی بہنوں سے کہوں گی کہ وہ اس سے بہت زیادہ نقصان پہنچاتی ہیں۔ شادی کرنا کوئی بُری بات نہیں۔ اگر وہ اپنے لئے شادی کی زندگی کو بہتر سمجھیں تو اس میں انھیں کسی قسم کی جھجک محسوس نہیں ہونی چاہیئے۔ انھیں صاف صاف اس کے متعلق کہہ دینا چاہیئے۔ اپنے فیصلے کو غلط باتوں کی آڑ میں نہیں چھپانا چاہیئے۔

(۶) لیڈی ڈاکٹروں کو صرف عورتوں اور بچوں کا علاج کرنا چاہیئے انھیں (Male patients.) کی طرف بالکل نہیں آنا چاہیئے۔ اصل یہ ہے کہ عورتوں اور بچوں کے ہسپتال ہی الگ ہونے چاہئیں جن میں مردوں کا گذر نہیں ہونا چاہیئے۔ موجودہ حالات میں بھی بالخصوص اسپیشل وارڈوں میں کسی نرس اور لیڈی ڈاکٹر کی ڈیوٹی نہیں لگانا چاہیئے۔

(۷) موجودہ حالات میں ہمارے ہاں ان عورتوں کی رہائش اور حفاظت کا کوئی انتظام نہیں جو پروفیشن کو زندگی بنانا چاہیں اور شادی نہ کریں۔ ہسپتالوں اور ہوسٹلوں میں جو انتظامات ہیں وہ عام طور پر اطمینان بخش نہیں اس وقت اس کا انتظام صرف ماں باپ ہی کر سکتے ہیں۔ جہاں باپ اپنی لڑکیوں کو میڈیکل کی تعلیم دلانا چاہیں انھیں پہلے سوچ لینا چاہیئے کہ انھوں نے زندگی بھر ان لڑکیوں کی عزت کرنی ہے۔ انھیں ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچانی ہیں۔ ان میں (self-confidence) پیدا کرنا ہے۔ سوسائٹی کی باتوں سے ان کی حفاظت کرنی ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انھیں ساری عمر بچیاں نہیں سمجھتے رہنا۔ انھیں ان کے حاکم اور داروغہ نہیں، بلکہ دوست بن کر رہنا ہے۔ اور اگر وہ غریبوں کی مدد کرنا چاہیں تو اس میں ان کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیئے۔ انہیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ لیڈی

ڈاکٹر کی ڈیوٹی ایسی ہے کہ اگر وہ نوکری کرتی ہے تو اسے مردوں سے ضرور واسطہ پڑے گا۔ اور اگر وہ اپنی پریکٹس کرتی ہے تو اسے لوگوں کے گھر بھی جانا پڑے گا۔ اور ہو سکتا ہے کہ وہاں راتیں بھی گزارنی پڑیں۔ جس باپ پر یہ باتیں گوارا گزرتی ہوں اسے چاہیئے کہ بیٹی کو لیڈی ڈاکٹر نہ بنائے۔ اسے ڈاکٹر بنا دینا اور ان باتوں پر اسے ٹوکتے رہنا اس کی زندگی کو جہنم بنا دینا ہے۔

(۸) سب سے بڑھ کر یہ کہ شروع سے ان لڑکیوں کے دل میں قرآن شریف کی بتائی ہوئی (Higher values) کا خیال پختہ کرتے رہنا چاہیئے اس سے ان کے سامنے زندگی کا بلند مقصد آئے گا اور جب بلند مقصد سامنے آئے گا تو پھر پست خیالات دل میں نہیں آئیں گے۔ اس سے یہ سوسائٹی میں اپنی تعظیم خود کرالیں گی۔ پاکیزہ زندگی میں بہت بڑی طاقت ہوتی ہے۔

(۹) ہماری تعلیم اور سوسائٹی کے حالات میں ایسی تبدیلی ہونی چاہیئے جس سے شادی کی زندگی، لڑکیوں کے پروفیشن کے راستے میں حائل نہ ہو۔ میرا خیال ہے (اور یہ بات میں اپنے تجربے کی بنا پر بھی کہہ سکتی ہوں کہ) لڑکیوں کو پڑھانا بھی ایک عورت ہی سکتی ہے اور عورتوں کا علاج بھی ایک عورت ہی کر سکتی ہے۔ اس لئے ہمیں لیڈی ڈاکٹروں اور لیڈی پروفیسروں کی اشد ضرورت ہے۔ جب تک ان پروفیشنوں کے راستے میں شادی رکاوٹ بن کر کھڑی رہے گی، ہماری ضرورت پوری نہیں ہو گی۔ لیکن یہ تو مستقبل کی بات ہے، اس وقت تو اس مسئلہ کا وہی حل ہے جو میں نے اوپر لکھا ہے۔

اخیر میں آپ سے ایک معافی مانگنا چاہتی ہوں۔ میں نے پہلے اس خط میں تمام واقعات نام اور پتے کے ساتھ ٹھیک ٹھیک لکھے تھے۔ لیکن پھر خیال آیا کہ چونکہ یہ خط طلوع اسلام میں شائع ہو گا اس لئے ہو سکتا ہے کہ بعض لوگوں کو جن کا تعلق ان واقعات سے ہے یہ بات بُری لگے۔ اس لئے میں نے ان واقعات میں اور خود اپنے حالات میں اتنی سی تبدیلی کر دی ہے کہ جو لوگ ان سے متعلق ہیں وہ پہچانے نہ جائیں۔ بس اتنی تبدیلی ہے۔ واقعات سب سچے ہیں۔

آپ کی بیٹی "طاہرہ"

طاہرہ بیٹی۔ خدا تمہیں خوش رکھے۔ سائنس کی طالب علم ہونے کے باوجود تمہارا خط صاف ہے۔ یہ غالباً طلوع اسلام سے دلچسپی کا نتیجہ ہے۔ میں پہلے ہی بہت سی "طاہرہ بیٹیوں" کے غم میں گھل رہا تھا! تمہاری تلخ زندگی کے حالات معلوم کر کے اس غم میں اور اضافہ ہو گیا۔ اگر میں تمہارے لئے کچھ کر سکتا ہوں تو مجھے لکھو۔ تمہاری سہیلی

جب ولایت سے آئے تو اس سے کہنا مجھے ضرور ملے۔

۲۔ تمہارے مشورے بڑے مفید اور قابل قدر ہیں۔ خدا کرے ہمارا معاشرہ، بالخصوص لڑکیوں کے والدین اور ارباب حل وعقد، ان مشوروں سے فائدہ اٹھا کر موجودہ حالات کو بہتر بنانے کی کوشش کریں۔ ہماری بچیوں کا مسئلہ واقعی بڑا اہم اور نازک ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ اب "طاہرہ بیٹیاں" ان مسائل سے اس قدر دلچسپی لینے لگ گئی ہیں۔ میں ان کی مشکلات کے حل کے لئے اپنی طرف سے انتہائی کوشش کرتا ہوں اور کئے جاؤں گا۔ یہ میرے کارِ زندگی کے مشن کا ایک حصہ ہے۔

پرویز

احادیث پر نظرِ ثانی

قاہرہ۔ ۱۲ر مارچ۔ مشرق وسطیٰ کی نیوز ایجنسی نے اطلاع دی ہے کہ مسلمان علماء کی کانفرنس جو جولائی میں قاہرہ میں منعقد ہونے والی ہے، اس میں دنیا کے مختلف ملکوں کے ممتاز علماء اپنا زیادہ تر وقت احادیث پر نظرِ ثانی پر صرف کریں گے۔

(بحوالہ نوائے وقت۔ ۱۳ر مارچ ۱۹۶۱ء)

طلوعِ اسلام

خدا کرے کہ یہ حضرات، قرآن کریم کو صحت وسقم کا معیار قرار دیکر احادیث پر نظرِ ثانی کریں۔ یہ کام، اسلام کی ایک عظیم و جلیل خدمت، اور بحضور رسالت مآبؐ عقیدت و ارادت کا مقدس ترین ہدیہ نیاز ہوگا۔

پاکستان میں اعشاری سکے

نئے اعشاری نظام میں صفر کا مقام

بے قیمت یا بیش قیمت

آنے / پائی		۳	۶	۹
۰	...	۲	۳	۵
۱	۶	۸	۹	۱۱
۲	۱۲	۱۴	۱۶	۱۷
۳	۱۹	۲۰	۲۲	۲۳
۴	۲۵	۲۷	۲۸	۳۰
۵	۳۱	۳۳	۳۴	۳۶
۶	۳۷	۳۹	۴۱	۴۲
۷	۴۴	۴۵	۴۷	۴۸
۸	۵۰	۵۲	۵۳	۵۵
۹	۵۶	۵۸	۵۹	۶۱
۱۰	۶۲	۶۳	۶۶	۶۷
۱۱	۶۹	۷۰	۷۲	۷۳
۱۲	۷۵	۷۷	۷۸	۸۰
۱۳	۸۱	۸۳	۸۴	۸۶
۱۴	۸۷	۸۹	۹۱	۹۲
۱۵	۹۴	۹۵	۹۷	۹۸
۱۶	۱۰۰	...	...	...

مثال:- ایک آنہ تین پائی = آٹھ نئے پیسے

یکم جنوری ۱۹۶۱ء کے بعد سے پاکستانی کرنسی کی دونوں اکائیوں (روپے اور پیسے) کو اعشاریہ کے دو درجوں تک لکھا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک روپیہ چار پیسوں کو ۱۰۰۴ لکھنا چاہیئے۔ نہ کہ ۱۰۴۔ اسی طرح ۲۵ روپے اور ۵۰ پیسوں کو ۲۵/۵ نہیں بلکہ ۲۵/۵۰ لکھنا درست ہے۔ آپ بھی اس کا خیال رکھیں۔

تبادلہ کا حسابی نقشہ:- اس نقشے کو روزمرہ استعمال کے لئے کاٹ لیجئے

رقم میں صفر احتیاط سے لگائیے

جاری کردہ: وزارت مالیات حکومت پاکستان

O.F.F.　　　　united ad.

بابُ المراسلات

(نفسِ انسانی کے متعلق)

کراچی سے ایک صاحب لکھتے ہیں:-

"آپ جو قرآنی فکر پیش کرتے ہیں اس میں انسانی نفس یا انسانی ذات کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے۔ "نفس" کے متعلق کچھ دھندلے سے تصورات تو ہمارے ذہن میں آگئے ہیں لیکن میں چاہتا تھا کہ جس طرح آپ نے اپنی لغات میں قرآن مجید کے اور تصورات سے تفصیلی بحث کی ہے اسی طرح "نفس" کی بحث بھی سامنے آجاتی۔ غالباً یہ بحث لغات کی چوتھی جلد میں آئے گی۔ لیکن اس میں شاید ابھی دیر لگ جائے اور میں اس کے معلوم کرنے کے لئے بہت بیقرار ہوں۔ اس لئے شکر گزار ہوں گا اگر آپ اس کے متعلق طلوع اسلام کی آئندہ اشاعت میں تفصیل سے لکھ دیں۔"

"نفس" سے متعلق تفصیلی بحث لغات القرآن کی چوتھی (اور آخری) جلد میں آگئی ہے جو عنقریب شائع ہو جائے گی جس وقت آپ کا خط ملا اتفاق سے اس کے دو تین دن بعد، لغات کا وہ پروف میرے سامنے آگیا جس میں نفس کا مادہ (ن - ف - س) شامل ہے۔ آپ کی بیتابیٔ تمنا کے پیش نظر وہی مادہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ اس میں پہلے اس مادہ کی لغوی بحث ہے اور آخر میں نفس انسانی کے متعلق تصریحات۔ واضح رہے کہ آخروی زندگی پر یقین، قرآن کی رُو سے اجزائے ایمان میں سے ہے اور اس زندگی پر ایمان کی عمارت اس بنیاد پر استوار ہوتی ہے کہ انسان صرف اس کے طبیعی جسم سے عبارت نہیں جس کا موت کے ساتھ خاتمہ ہو جاتا ہے۔ بلکہ اس میں، جسم کے علاوہ کچھ اور بھی ہے، جو اس کے جملہ اعمال کی ذمہ دار اور ان کے نتائج کی حامل ہے اور جو طبیعی موت سے فنا نہیں ہو جاتی۔ اسی کو انسانی ذات (یا نفس) کہتے ہیں۔ قرآن نے اس کے لئے "ذات" کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ اسے "نفس" سے تعبیر کیا ہے یہ لفظ قرآن میں اور بھی بہت سے معانی کے لئے استعمال ہوا ہے۔

اب آپ لغات القرآن (جلد چہارم) سے (ن - ف - س) کا عنوان ملاحظہ فرمالیجئے۔

پرویز

ن ف س

صاحب تاج العروس نے لکھا ہے کہ نفس کے بہت سے معنی ہیں۔ منجملہ ان کے یہ لفظ انسانی شخصیت کے ظاہری اور باطنی پہلوؤں کے مجموعہ پر بولا جاتا ہے۔ نیز وہ توانائی جس سے تمیز کی صلاحیت، شعور اور احساس کی قوت پیدا ہوتی ہے۔ عقل، علم اور قلب کے معنوں میں بھی آتا ہے[1]۔ اور عَیْنُ الشَّیْءِ کے معنوں میں بھی۔ جیسے جَآءَ نِی الْمَلِکُ بِنَفْسِہٖ۔ بادشاہ میرے پاس بنفسِ نفیس آیا۔ نیز عظمت اور بڑائی، ہمت، غیرت، ارادہ اور عقوبت (سزا) کے معنوں میں بھی۔ نیز نفس کے معنی بھائی بند کے بھی ہوتے ہیں[2]۔ اس کے علاوہ خون کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ نِفَاسٌ اس خون کو کہتے ہیں جو ولادت کے بعد عورتوں کو آتا ہے[3]۔ خود ولادت (عورت کے بچہ جننے) کے معنوں میں بھی یہ لفظ آتا ہے۔ نَفَسٌ۔ سانس کو کہتے ہیں۔ اس کی جمع اَنْفَاسٌ آتی ہے[4]۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی ہلکی اور نرم ہوا کے نکلنے کے ہیں۔ نَفَسٌ کے معنی وسعت اور کشادگی کے بھی ہیں۔ ایک کش اور گھونٹ کو بھی کہتے ہیں۔ اور طویل چیز کو بھی۔ نَفِیْسٌ مال کثیر کو کہتے ہیں اور شَیْءٌ نَفِیْسٌ وہ عمدہ چیز ہے جس کی طرف انسان لپک کر جائے۔ تَنَفَّسَ کے معنی ہیں سانس لینا۔ نیز تَنَفَّسَ الصُّبْحُ کے معنی ہیں صبح کا واضح اور روشن ہو جانا (۸۱/۱۸)۔ نَافَسَ اور تَنَافَسَ کے معنی کسی اچھے کام میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کرنا ہیں۔ (۸۳/۲۶)

نیز اس کے معنی عِنْدِیْ (میرے پاس) کے بھی ہوتے ہیں۔ تاج العروس نے اس کی مثال کے لئے سورۂ مائدہ کی آیت تَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِیْ وَلَآ اَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِکَ (۵/۱۱۶) لکھی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ (اے میرے رب)، جو کچھ میرے دل میں ہے تو اسے جانتا ہے لیکن جو کچھ تیرے ہاں (پاس) ہے میں اسے نہیں جانتا۔

اس کے علاوہ اس کے معنی عقوبت (یا سزائے اعمال) کے بھی ہیں۔ مثلاً وَیُحَذِّرُکُمُ اللّٰہُ نَفْسَہٗ (۳/۲۸)۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ خدا تمہیں اپنے آپ سے یا اپنی ذات سے ڈراتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تمہیں اپنے قانونِ مکافات کی رو سے مرتب ہونے والے تباہ کن نتائج سے محتاط رہنے کی تاکید کرتا ہے[5]۔

اَنْفُسٌ کے معنی بھائی بند بھی ہیں (۲۴/۶۱) اور خود اپنا آپ بھی (۲/۵۴)۔ اس قسم کے مقامات میں یہ ان معانی میں استعمال ہوتا ہے جن معنی میں انگریزی زبان میں مثلاً (Myself) یا (yourself) یا (Himself) وغیرہ۔

---

[1] - [2] - [3] - [4] - [5] تاج و ابن فارس۔ تاج و لسان العرب [6] تاج و لسان العرب۔

استعمال ہوتے ہیں۔

علاوہ بریں اس لفظ (نَفْسٌ) کو قرآن کریم نے اس "شے" کے لئے بھی استعمال کیا ہے جسے ہم انسانی ذات (Human personality) یا (اقبال کی اصطلاح میں) خودی (Self) یا انا (I-am-ness) کہتے ہیں۔ یہ مفہوم وضاحت طلب ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ دین کی اصل و بنیاد انسانی ذات کے اقرار پر استوار ہے تو اس میں قطعاً مبالغہ نہیں ہوگا۔ دنیا میں اصولی طور پر دو قسم کے تصورات حیات پائے جاتے ہیں۔ ایک تصور حیات یہ ہے کہ انسانی زندگی محض طبیعی زندگی (physical life) ہے۔ انسان طبیعی قوانین کے مطابق زندہ رہتا ہے۔ انہی قوانین کے ماتحت اس کے جسم کی پرورش ہوتی ہے اور انہی قوانین کی رو سے یہ آخر الامر مر جاتا ہے۔ اور جب اس کے تنفس (سانس) کی آمد و رفت کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے تو اس کے ساتھ ہی اس فرد کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے۔ عصر حاضر کی زبان میں اسے مادی نظریۂ حیات (Materialistic concept of life) کہتے ہیں۔ جسے عام طور پر "مغربی تہذیب" کہا جاتا ہے وہ اسی نظریۂ حیات کی مظہر ہے۔ ظاہر ہے کہ اس نظریہ کی رو سے انسان کو نہ خدا پر ایمان لانے کی ضرورت پڑتی ہے۔ نہ وحی کو تسلیم کرنے کی حاجت۔ اس نظریہ کے قائل اگر خدا کی ہستی کا اقرار بھی کریں گے تو (زیادہ سے زیادہ) اس حد تک کہ کائنات کو خدا نے پیدا کیا ہے اور یہ اس کے قوانین کے مطابق سرگرم عمل ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ خدا پر اس قسم کے ایمان سے انسانی زندگی پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔ اگر ایک شخص کہتا ہے کہ اس کائنات کو خدا نے پیدا کیا ہے اور دوسرا کہتا ہے کہ نہیں! یہ یونہی اتفاقیہ طور پر وجود میں آگئی ہے، تو اس اقرار اور انکار سے ان کی زندگی پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم اس قسم کے ایمان کو ایمان ہی تسلیم نہیں کرتا (دیکھئے مثلاً ۲۹/۶۱-۶۳ ؛ ۲۳/۸۴-۸۹ ؛ ۳۱/۲۵ ؛ ۳۹/۳۸ ؛ ۴۳/۹)۔ اسی طرح جو شخص یہ کہتا ہے کہ زندگی بس اس طبیعی زندگی کا نام ہے۔ موت انسان کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ تو اس کے نزدیک خیر اور شر کا معیار بھی خود ساختہ ہو جاتا ہے۔ خیر وہ جس سے اسے فائدہ پہنچے، یا زیادہ سے زیادہ، جسے معاشرہ (سوسائٹی) اچھا کہہ دے۔ اور شر وہ جس سے اسے نقصان پہنچے یا جسے سوسائٹی معیوب سمجھے۔ اس کے نزدیک اس کے اپنے فیصلوں یا معاشرہ کے متعین کردہ قوانین و ضوابط سے بالا کوئی قانون نہیں ہو سکتا۔ اس کی زندگی کا مقصد اپنے جذبات کی تسکین ہوتا ہے، اور بس۔ قرآن کریم اسے کفر کی زندگی قرار دیتا ہے۔ سورۃ الجاثیہ میں ہے۔ اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ کیا تم نے اس شخص کی حالت پر بھی غور کیا جو اپنے جذبات ہی کو اپنا اِلٰہ بنا لیتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وَ اَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ۔ وہ قانون خداوندی کے مطابق، اپنے علم کے باوجود غلط روش زندگی پر چلتا ہے۔ وَ خَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَ قَلْبِهٖ وَ جَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً۔ اور جذبات پرستی کا طوفان اس کے کان اور دل پر

مہر لگا دیتا ہے اور اُس کی آنکھوں پر پردے پڑ جاتے ہیں۔ فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْ بَعْدِ اللّٰهِ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ (۴۵/۲۳) اور یہ ظاہر ہے کہ جو شخص خدا کے مقرر کردہ قانون کے مطابق اس حالت تک پہنچ جائے، اس کی صحیح راستے کی طرف بجز خدا کے قانون کے اور کون راہ نمائی کر سکتا ہے۔ سو کیا تم ایسے شخص کی حالت دیکھ کر نصیحت حاصل نہیں کرتے۔

یہ وہ لوگ ہیں وَقَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ۔ جو کہتے ہیں کہ زندگی بس اسی دنیا کی زندگی ہے۔ ہم (قوانینِ طبیعی کے مطابق) مرتے ہیں اور جیتے ہیں۔ اور مرورِ زمانہ (وقت) ہمیں ہلاک کر دیتا ہے۔ وَمَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ۔ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ (۴۵/۲۴) انہیں حقیقتِ حال کا کچھ علم نہیں ہوتا۔ یہ محض ظن و قیاس سے کام لے کر اس قسم کا تصور قائم کر لیتے ہیں۔

قرآن کریم اس زندگی کو حیوانی سطح زندگی قرار دیتا ہے۔ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ (۴۷/۱۲) جو لوگ (بلند سطح زندگی سے) انکار کرتے ہیں وہ حیوانوں کی طرح کھاتے پیتے اور سامانِ زیست سے فائدے اٹھاتے (اور پھر مر جاتے) ہیں۔

اس کے برعکس، دوسرا تصورِ زندگی یہ ہے کہ انسانی زندگی صرف اس کے جسم کی زندگی نہیں۔ جسم کے علاوہ انسان میں ایک اور "شے" بھی ہے جسے اس کی ذات، یا نفس کہتے ہیں۔ یہ قوانینِ طبیعی کے ماتحت نہیں ہوتی۔ نہ ہی جسم کی موت سے اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اس سے انسان مرنے کے بعد بھی زندہ رہتا ہے۔ اگر اس کی مناسب نشوونما کی جائے تو انسان کی موجودہ زندگی بھی خوشگوار اور سرسبز و شاداب ہوتی ہے اور مرنے کے بعد، وہ زندگی کے مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ انسانی ذات کی نشوونما ان قوانین کی رُو سے ہوتی ہے جو خدا کی طرف سے، حضرات انبیاء کرامؑ کی وساطت سے بذریعہ وحی ملتے ہیں (اور جو اب قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں)۔ اس سے آپ نے دیکھ لیا کہ انسانی ذات پر "ایمان" اور خدا، وحی، نبوت اور آخرت پر ایمان کس طرح لازم و ملزوم ہیں۔

"انسانی ذات کیا ہے" یہ نہ بتایا جا سکتا ہے نہ سمجھا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ یہ کوئی مادی شے نہیں۔ انسانی ذات کا مظاہرہ اس کے اختیار و ارادہ سے ہوتا ہے۔ اس لئے ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک ایسی غیر مادی "شے" ہے جو اختیار و ارادہ کی استعداد کی حامل ہے۔ اختیار و ارادہ (بصورتِ مطلق اور کُلّی طور پر) خدا کو حاصل ہے اور اس کا عطا کردہ، (محدود شکل میں) انسان کو حاصل ہے۔ اس کے سوا کائنات میں کسی اور کو اختیار و ارادہ حاصل نہیں۔ اسی لئے اسے خدا نے "روحنا" کہہ کر پکارا ہے۔ یعنی الوہیاتی توانائی (Divine energy) (دیکھئے عنوان ر۔ و۔ ح)۔ اگر انسان، قوانینِ خداوندی کا اتباع کرے تو اس کی ذات میں (حدِ بشریت کے اندر) صفاتِ خداوندی منعکس ہوتی جاتی ہیں۔ اسی کو اس کی ذات کی نشوونما کہتے ہیں۔ واضح رہے کہ انسانی ذات، ذاتِ خداوندی کا جزو نہیں۔ ذات (وہ خدا کی ہو یا انسان کی) ایک غیر منقسم وحدت (Indivisible whole)

ہوتی ہے جس کے حصے بخرے ہو نہیں سکتے۔

چونکہ انسان کے ہر عمل کی بنیاد اس کے ارادہ پر ہوتی ہے، اس لئے اس کے ہر عمل کا اثر اس کی ذات پر مرتب ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ اس کے دل میں گذرنے والے خیالات اور نگاہ کی خیانت تک کا بھی (۴۰/۱۹)۔ یہی اس کا "اعمال نامہ" ہے جو اس کی گردن میں لٹکا رہتا ہے۔ (۱۷/۱۳)۔ اسی کو وہ ظہورِ نتائج کے وقت پڑھے گا۔ اِقْرَاْ كِتَابَكَ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا (۱۷/۱۴)۔ "تو آج اپنی کتاب پڑھ۔ آج تیرا نفس خود تیرا احتساب لینے کے لئے کافی ہے" (نیز ۸۴/۷-۱۴)

اسی سے انسانی ذات کی انفرادیت (individuality) ثابت ہوتی ہے (۱۹/۹۵؛ ۶/۹۵)۔ یعنی ہر انسانی ذات منفرد (Unique) ہوتی ہے اور اس کے ہر عمل کا اثر اس کے اپنے اوپر ہوتا ہے۔ کوئی دوسرا اس میں شریک نہیں ہو سکتا۔ وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا۔ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (۶/۱۶۵)۔ ہر نفس کو اپنے اعمال کا خمیازہ خود بھگتنا پڑتا ہے۔ کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ (اس ضمن میں حسب ذیل آیات بھی دیکھئے۔ (۲/۱۳۴؛ ۲/۲۸۱؛ ۳/۲۵؛ ۴/۱۱۱؛ ۶/۱۶۴؛ ۱۰/۳۰؛ ۱۴/۵۱؛ ۱۶/۱۱۱؛ ۲۹/۱۲؛ ۳۱/۳۳؛ ۳۵/۱۸؛ ۳۹/۷؛ ۴۵/۲۸؛ ۵۳/۳۸؛ ۷۴/۳۸۔ نیز ۶/۹۴؛ ۸۲/۱۹؛ ۷۴/۳۸)۔ جب اتباعِ قوانینِ خداوندی سے انسانی ذات کی نشوونما ہوتی ہے تو (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے) اس میں زندگی کے مزید ارتقائی منازل طے کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اسے مرنے کے بعد جنت کی زندگی کہتے ہیں۔ لیکن جس ذات کی نشوونما نہیں ہوتی، وہ آگے بڑھنے سے رک جاتی ہے۔ یہ جہنم یا جحیم کی زندگی ہے۔ (دیکھئے عنوانات (ج-ن-ن)؛ (ج-ح-م)؛ (جہنم)]۔ یوں تو انسانی ذات کی نشوونما کے لئے پورے کے پورے ضابطۂ قرآنی کا اتباع ضروری ہے (اور یہ اتباع قرآنی معاشرہ کا جزو ہی کہا جا سکتا ہے) لیکن قرآن کریم نے اس باب میں ایک بنیادی نکتہ بیان کیا ہے جو بڑا اہم ہے۔ انسانی جسم کی پرورش ہر اس شے سے ہوتی ہے جسے وہ خود کھا (یا پی) لیتا ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ میں کھانا کھاؤں اور آپ کے جسم کی پرورش ہوتی جائے۔ اس کے برعکس انسانی ذات کی نشوونما ہر اس چیز سے ہوتی ہے جسے ہم دوسروں کی نشوونما کے لئے دیں۔ وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى الَّذِىْ يُؤْتِىْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى (۹۲/۱۷-۱۸)۔ جہنم سے اسے بچایا جاتا ہے جو اپنے مال کو (یا جو کچھ اس کے پاس ہے اسے) اپنی نشوونما کے لئے دیتا ہے۔ "تقویٰ شعار بھی وہی ہوتا ہے جو دیتا ہے۔ مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى (۹۲/۵)" جو دیتا ہے اور (اس طرح) تقویٰ اختیار کرتا ہے" (نیز دیکھئے (۹/۱۰۳؛ ۲/۲۶۵)

یاد رہے کہ انسانی ذات، ایک ملکہ، صلاحیت، استعداد، یا امکانی قوت ہے جو بجائے خویش نہ خیر ہے نہ شر۔ دوسری ہر قوت کی طرح، اس کا استعمال اسے خیر یا شر بنا دیتا ہے۔ جب انسان اسے انسانیت کی بلند اقدار (Higher values) کے تحفظ اور استحکام کے لئے عمل میں لاتا ہے، تو یہ خیر کا موجب بن جاتی ہے (اسی سے اس کی نشوونما ہوتی ہے) اور جب انسان اپنے اختیار و ارادہ کو، پست مفادِ خویش کے خاطر استعمال کرتا

(جس میں بلند اقدار کو پس پشت ڈال دیا جاتا ہے) تو یہ شر کا مظہر بن جاتی ہے۔ اس صورت میں (محض تمیز کی خاطر) ہم انسانی ذات کو ایگو (Ego) سے تعبیر کرتے ہیں۔ ایگو، حیوانی سطح زندگی پر ہوتا ہے اور ذات، انسانی سطح زندگی پر۔ جب انسانی جذبات (Emotions) ایگو کے تابع چلتے ہیں تو قرآن کریم انہیں "ھویٰ" کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔ (اس مادہ میں "پستی" کا مفہوم ہوتا ہے۔ دیکھئے عنوان ہ-و-ی) اور جب عقل (Intellect) ایگو کی خادمہ بنتی ہے تو مکر و فن کہلاتی ہے۔ اس کے برعکس جب جذبات انسانی ذات کے ماتحت رہتے ہیں تو بلند ترین جوہر انسانیت بن جاتے ہیں اور جب عقل، انسانی ذات کے تابع فرمان رہتی ہے تو انسانی زندگی اور معاشرہ جنت بداماں ہو جاتا ہے (اقبال اول الذکر عقل کو، عقلِ خود بیں اور ثانی الذکر کو عقلِ جہاں بیں، یا خرد "ادب خوردہ دل" کہہ کر پکارتا ہے)۔

جب ایگو، کسی مستقل قدر کو پس پشت ڈال کر، پست مفاد کی طرف جاتا ہے تو اسے عام طور پر "نفس امارہ" کہا جاتا ہے۔ یہ اصطلاح قرآن کریم کی اس آیت سے لی گئی ہے جس میں اس نے، عزیز مصر کی بیوی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَۃٌ بِالسُّوْٓءِ (۱۲/۵۳)۔ یقیناً نفس، برائی کا حکم دیتا رہتا ہے۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ نفس انسانی ہے ہی برائی کا حکم دینے والا۔ بالکل نہیں۔ یہ ایگو کے متعلق کہا گیا ہے۔ چنانچہ اس کے بعد ہے اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ (۱۲/۵۳)۔ بجز اس کے جس پر خدا کی رحمت ہو۔ یہ نفس کی وہ سطح ہوگی جسے ہم نے "انسانی ذات" سے تعبیر کیا ہے۔

بعض اوقات نفس انسانی کی یہ کیفیت بھی ہوتی ہے کہ جب اس سے کوئی برائی سرزد ہو جائے تو اس کے بعد اس میں احساس ندامت بیدار ہو جاتا ہے۔ یہ درحقیقت، ایگو اور ذات میں ایک قسم کی کشمکش کی حالت ہوتی ہے اسے قرآن کریم نے نفس لوامہ کہا ہے (۷۵/۲)۔ یعنی "ملامت کرنے والا نفس"۔ اس سلسلہ میں اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ انسانی ذات میں اس کی استعداد نہیں کہ وہ خیر اور شر میں خود تمیز کر سکے۔ خیر اور شر کی تمیز صرف وحی کی رو سے ہو سکتی ہے۔ نفس لوامہ اسی بات پر ملامت کرے گا جسے وہ معیوب سمجھتا ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ جس بات کو وہ معیوب سمجھتا ہے وہ درحقیقت معیوب ہو، اور جسے وہ محمود قرار دیتا ہے وہ درحقیقت ممدوح ہو۔ (تفصیل اس اجمال کی (ل-و-م) اور (ف-ط-ر) کے عنوانات میں ملے گی)۔

جب انسان، خالص قوانین خداوندی کا اتباع کرتا ہے، تو ایگو اور ذات کی کشمکش ختم ہو جاتی ہے۔ ذات پست جاذبیتوں پر غالب آ جاتی ہے۔ (۸۹/۲۷)۔ اسے قرآن کریم نے نفس مطمئنہ سے تعبیر کیا ہے (۸۹/۲۷) جس کی زندگی جنت کی زندگی ہے (۸۹/۳۰)۔ اسے عصر حاضر کی علم النفس کی زبان میں (Integrated Personality) کہا جائے گا۔ اس کے برعکس (Disintegrated Personality) ہوگی۔ قرآن کریم نے نفس کی ان دونوں کیفیتوں کو فُجُوْرَھَا وَ تَقْوٰھَا (۹۱/۸) سے تعبیر کیا ہے۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان

ل۔ ص۔ م) اور ذات کی نشوونما (Development) کو انسانی زندگی کا مقصود اور کامیابی و کامرانی بتایا ہے۔ (۱۴/۹)

چونکہ انسانی ذات، امکانی شکل (Realiseable form) میں ہر انسانی بچہ کو پیدائش کے ساتھ یکساں طور پر ملتی ہے، اس لئے اس کی بنا پر ہر فرزندِ آدم، محض آدمی ہونے کی جہت سے واجب التکریم ہے۔ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ (۱۷/۷۰)۔ "ہم نے تمام فرزندانِ آدم کو واجب التکریم بنایا ہے"۔ ذات کی تکریم کے معنی یہ ہیں کہ کسی شخص کو حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے شخص کو اپنا محکوم بنائے۔ انسانی اختیار و ارادہ انسانی ذات کی بنیادی خصوصیت ہے۔ اس لئے کسی کے اختیار و ارادہ کو سلب کر لینا، اس سے اپنے فیصلے منوانا (اسی کو محکومی کہتے ہیں)، اُسے شرفِ انسانیت سے محروم کر دینا ہے۔ قرآن کریم کی رو سے اطاعت یا محکومی، صرف قوانینِ خداوندی کی ہو سکتی ہے۔ (اسی کو عبادت کہتے ہیں۔ دیکھئے عنوان ع۔ ب۔ د)۔ یہ اطاعت کسی مستبد حاکم کی عائد کردہ پابندیوں کا نام نہیں ہوتا۔ انسان ان پابندیوں کو اپنے اوپر خود عائد کرتا ہے۔ (اطاعت کے معنی ہی بطیبِ خاطر، برضا و رغبت، اپنے اوپر کسی پابندی کا عائد کرنا ہے) اور اس لئے عائد کرتا ہے کہ اس سے اس کی ذات کی نشوونما ہوتی ہے۔ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (۲/۲۸۶) سے یہی مراد ہے۔ یعنی قوانینِ خداوندی انسان پر جو پابندیاں عائد کرتے ہیں تو اس سے مقصد، خود انسانی ذات میں وسعت پیدا کرنا ہوتا ہے۔ نہ کہ اس کی آزادی کو سلب کرنا۔ (دیکھئے عنوان ك۔ ل۔ ف) قرآنی معاشرہ اس قسم کی فضا پیدا کرتا ہے جس میں کوئی کسی کا محکوم نہیں ہوتا اور اس طرح انسانی ذات کی وسعتیں حدود فراموش ہوتی چلی جاتی ہیں۔ اس سے انسان کو اس دنیا میں بھی جنتی زندگی حاصل ہو جاتی ہے اور آخرت میں بھی جنتی زندگی۔ خانقاہیت کی تجرد گاہوں میں انسانی ذات کی نشوونما کبھی نہیں ہو سکتی۔ جنت کے لئے فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ (۸۹/۲۹) پہلی شرط ہے۔

سورۃ زمر میں ایک آیت ہے اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْاُخْرٰٓى اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى (۳۹/۴۲) اللہ موت کے وقت نفوس کو موقوف کر دیتا ہے اور جو مرتے نہیں ان کی نیند کی حالت میں ایسا کر دیتا ہے۔ پھر جن پر موت کا حکم ہو جاتا ہے تو انہیں روک لیتا ہے اور دوسروں کو ایک وقت مقرر تک واپس بھیج دیتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس آیت میں "نفس" سے کیا مطلب ہے جسے موت اور نیند دونوں حالتوں میں موقوف کر دیا جاتا ہے اور جب انسان جاگ اٹھتا ہے تو اُسے واپس کر دیا جاتا ہے۔ لیکن بصورتِ موت اسے واپس نہیں کیا جاتا۔ جہاں تک نیند کا تعلق ہے ہم جانتے ہیں کہ اس میں انسان کا سب کچھ موجود ہوتا ہے بجز شعور (Consciousness)

کے۔ (حتیٰ کہ اس میں تحت الشعور بھی باقی ہوتا ہے) اس لئے ظاہر ہے کہ اس آیت میں "نفس" سے مراد انسانی شعور کی حالت ہے۔ یعنی نیند اور موت دونوں حالتوں میں اس کا شعور باقی نہیں رہتا۔ سونے والا جب جاگ اٹھتا ہے تو اس کا شعور پھر روبہ عمل ہو جاتا ہے۔ لیکن موت کی صورت میں شعور کا تعلق اس جسم کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے۔ موت کے بعد شعور کے روبہ عمل ہونے کو حیات بعد الممات کہتے ہیں۔ اس زندگی میں شعور (یا نفس) کس طرح روبہ عمل ہوتا ہے، ہم اپنے شعور کی موجودہ سطح پر اسے نہیں سمجھ سکتے۔ اس لئے کہ اس وقت ہمارے شعور کے روبہ عمل ہونے کا ایک ہی ذریعہ ہے۔ اور وہ ہے ہمارا مادی جسم۔ ہم اس وقت جسم کے توسط کے بغیر شعور کی کارفرمائی کا تصور ہی نہیں کر سکتے۔ قرآن کریم نے یہ نہیں بتایا کہ حیات بعد الممات میں شعور کی کارفرمائی کا ذریعہ کیا ہوگا۔ نہ ہی اس کے بتانے سے کوئی فائدہ تھا۔ اس لئے کہ جس بات کو ہم اپنے شعور کی موجودہ سطح پر سمجھ ہی نہیں سکتے اس کے بتانے سے حاصل کیا ہو سکتا ہے۔ لیکن مرنے کے بعد نفس کی کارفرمائی کو قرآن کریم ایک حقیقت ثابتہ کے طور پر بیان کرتا ہے۔ اس پر ہمارا ایمان ہے اور یہی دین کی اصل و بنیاد ہے۔

*

ایک اور رفیق کی جدائی

۱۹۸۰ء کے طلوع اسلام کا کنونشن نمبر دیکھئے۔ اس میں بزم پشاور، مردان اور کوہاٹ کی جو تصویر چھپی ہے اس میں (کرسیوں پر) بائیں جانب سب سے آخر میں ایک صاحب دکھائی دیں گے۔ تن و مند توانا جسم۔ متبسم چہرہ ــــ اسم گرامی، حاجی فقیر محمد خان صاحب۔ مردان کے بہت بڑے خان ــــ اور قرآنی فکر کے شیدائی اور سرگرم مبلغ۔ یہ خبر انتہائی غم و الم سے سنی جائے گی کہ حاجی صاحب کا حرکت قلب بند ہو جانے سے اچانک انتقال ہو گیا اور قرآنی احباب ایک مخلص ساتھی کی رفاقت سے محروم ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ حاجی صاحب مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ حلقۂ طلوع اسلام کے ہزارہا افراد اس الم انگیز سانحہ پر، حاجی صاحب کے متعلقین کے ساتھ برابر کے شریک غم ہیں۔

ادارہ طلوع اسلام

والعلۃ باھی

طلوعِ اسلام کنونشن

جس وقت یہ پرچہ آپ کو ملے گا، آپ طلوع اسلام کنونشن کی تیاریوں میں مصروف ہوں گے۔ کنونشن کا مختصر پروگرام (جس میں ہو سکتا ہے کہ وقت کے تقاضے کے مطابق کوئی تبدیلی کرنی پڑے) حسب ذیل ہو گا۔

۷ر اپریل، جمعہ ــــ صبح ــــ تعارف۔

خطبہ استقبالیہ (صدر کنونشن کمیٹی)

رپورٹ ـ (ناظم ادارہ طلوع اسلام)

رپورٹ تبلیغی کمیٹی و مجلس عاملہ۔ شیخ محمد شفیع صاحب

استقبالیہ خطاب ـ پرویز صاحب

مجلس نمائندگان (نمائندگان سے مراد کنونشن میں شریک ہونے والے بزموں کے اراکین ہیں)

سہ پہر ــ عام اجلاس ـ پرویز صاحب کا خصوصی خطاب

"صرف اسلام ہی کیوں سچا دین ہے؟"

شب ـ مجلس نمائندگان ـ قراردادیں و تقاریر۔

۸ر اپریل، ہفتہ، صبح ـ مجلس نمائندگان ـ قراردادیں و تقاریر

سہ پہر ـ کھلا اجلاس ـ عائلی قوانین اور عورتوں کے متعلق دیگر اہم مسائل ـ اس اجلاس سے بیشتر خواتین خطاب کریں گی۔

شب ـ کھلا اجلاس ـ درس قرآن کریم ـ یا استفسارات و جوابات

۹ر اپریل ـ اتوار ـ صبح ـ کھلا اجلاس ـ خصوصی خطاب پرویز صاحب

فردوس گم گشتہ (جس کی تلاش میں یورپ مارا مارا پھر رہا ہے۔)

اجلاس نمائندگان ــ الوداعی پیغام ــ (خدا حافظ)

۲۔ مجلس نمایندگان میں صرف بزموں کے وہ اراکین شامل ہو سکیں گے جو اپنی بزم کی طرف سے باقاعدہ کنونشن میں شریک ہوں گے۔ ان میں سے جو صاحب (کسی قرارداد کے علاوہ) تقریر کرنا چاہیں، ضروری ہوگا کہ وہ تقریر کا مسودہ پہلے بھیج دیں۔

۳۔ کھلے اجلاس میں شریک ہونے والے حضرات، تقاریر کو سن سکیں گے۔ اجلاس کی کارروائی میں حصہ نہیں لے سکیں گے۔ اس لئے کہ طلوعِ اسلام کنونشن، اس کی بزموں کے نمایندگان کا اجتماع ہوتا ہے۔ اس کی صورت عام جلسوں جیسی نہیں ہوتی۔

۴۔ جملہ رضاکار، ۵ اپریل، بدھ کی شام تک ضرور پہنچ جائیں۔

۵۔ جو حضرات جمعرات کی شب کو پہنچیں گے، وہ براہِ کرم اس امر کی اطلاع پہلے بھیج دیں۔

۶۔ کنونشن، حسبِ سابق کنونشن ہاؤس میں منعقد ہوگی۔ پتہ یہ ہے۔

جی۔ ٹی۔ روڈ۔ شالامار باغ سے تھوڑی دور آگے پاکستان منٹ (PAKISTAN MINT) ہے۔ اس کے بالکل سامنے طلوعِ اسلام کا بورڈ آویزاں ہوگا۔ بس کا اسٹاپ منٹ کے سامنے ہے۔

۷۔ موسم کے متعلق احباب کو پچھلے سال کا تجربہ ہے ہی۔ والسلام

آپ کی آمد کا منتظر

(چوہدری) عبدالرحمٰن۔ صدر کنونشن کمیٹی ـــــ ۲۰۔بی۔ شاہ عالم مارکیٹ۔ لاہور

ایک خصوصی رعایت

میزان پبلیکیشنز کا بک سٹال کنونشن کے ساتھ ہوگا۔ کنونشن کے دوران، جو احباب نقد کتابیں خریدیں گے انہیں دس فی صد رعایت دی جائے گی۔ کتابیں ادارہ کی بھی ہوں گی اور باہر کی اہم کتابیں بھی۔

رابطۂ باہمی ـــــ رپورٹیں

لندن

۵ مارچ کو بزم کا اجلاس (20 HOWARD WALK) میں ہوا۔ اراکینِ بزم کے علاوہ نئے حضرات و خواتین نے شرکت کی۔ اجلاس میں طلوعِ اسلام کے مقاصد کی اشاعت پر زور دیا گیا اور

اس کے لئے نئے خریدار بنائے گئے۔ محترم گلزار احمد صاحب چغتائی نے احباب سے خطاب کرتے ہوئے یہ حقیقت ذہن نشین کرانے کی کوشش کی کہ اس انقلابی فکر کی عالمگیر اشاعت کا تقاضا ہے کہ طلوع اسلام کی اشاعت کو کم از کم ایک لاکھ تک بڑھایا جائے اور اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ احباب اپنی مساعی میں اسے بنیادی اہمیت دیں کہ طلوع اسلام کی خریداری کی مہم بیش از بیش آگے بڑھتی جائے۔

اجلاس میں "مقام آدمیت" کے موضوع پر پرویز صاحب کی اہم تقریر ٹیپ ریکارڈر سے حاضرین کو سنائی گئی اور آخر میں یہ قرار پایا کہ عید رمضان کی تقریب سعید پر بزم لندن کی طرف سے ادارہ طلوع اسلام اور تمام بزمہائے طلوع اسلام کو ہدیۂ تبریک و سلام پیش کیا جائے۔

مردان

۱۰ مارچ کو بزم کا تعزیتی اجلاس ہوا جس میں احباب نے اپنے جلیل القدر رفیق حاجی فقیر محمد خان مرحوم کے سانحۂ ارتحال پر دلی اندوہ و ملال اور تعزیت کا اظہار کیا اور قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کے سلسلے میں مرحوم کی گراں مایہ خدمات کو خراج تحسین پیش کیا گیا۔ بعد ازاں سب نے بخلوص قلب مرحوم کے حق میں مغفرت اور پسماندگان مرحوم کے لئے صبر جمیل کی دعا کی۔

اجلاس میں عائلی قوانین کے آرڈیننس کے نفاذ کو تاریخ کا ایک اہم فیصلہ قرار دیا گیا اور اس مبارک اور قرآنی اصولوں پر مبنی اقدام پر صدر مملکت کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کیا گیا۔

اس سے قبل ۸ مارچ کے رات کے اجتماع میں "تقلید" کے موضوع پر پرویز صاحب کی تقریر ٹیپ ریکارڈر پر سنائی گئی اور پمفلٹس تقسیم کئے گئے۔ ادارہ کی مطبوعات اصحاب ذوق کو برائے مطالعہ مہیا کی جاتی ہیں۔

کراچی

بزم کا ماہانہ اجلاس ۴ مارچ کو نمائندہ بزم شیخ محمد شفیع صاحب کے دولتکدہ پر ہوا۔ تلاوت قرآن کریم کے بعد آئندہ سالانہ کنونشن کے سلسلہ میں احباب سے تجاویز طلب کی گئیں اور بعد ازاں ان کا جائزہ لیا گیا۔ زیادہ سے زیادہ احباب کی کنونشن میں شرکت پر زور دیا گیا۔ طلوع اسلام کے لئے خریدار کی مہم کامیابی سے جاری ہے۔ آئندہ اجلاس میں نئے سال کے لئے نمائندہ بزم کا انتخاب ہوگا۔ سندھ اسمبلی ہال میں آتشزدگی کے بعد سے درس قرآن کے لئے ابھی تک کسی موزوں ہال کا انتظام نہیں ہو سکا۔

عید کی تقریب سعید پر احباب جشن نزول قرآن کی مجلس آراستہ کر رہے ہیں۔

گوجرانوالہ

ہر ماہ بزم کے دو اجلاس باقاعدگی سے ہو رہے ہیں۔ ان میں مضافات کے احباب بھی شریک ہوتے ہیں۔ گذشتہ اجلاس میں حکمت، حمد، اور خلیفہ کا قرآنی مفہوم روشنی میں لایا گیا۔ ازاں بعد پمفلٹ تقسیم کئے گئے۔ احباب کا نصب العین قرآنی نظام ربوبیت کے لئے پیہم کوشش ہے۔ اردو تحفظ

یہ پسند نہیں کرتے کہ اس راہ سے ہٹ کر اپنی توانائیوں کو بے مقصد مذہبی بحثوں کے الجھاؤ میں ضائع کریں۔ آئندہ اجلاس احباب کے سامنے دعا کا قرآنی مفہوم لایا ہے۔

سرگودھا

گذشتہ ماہ بزم کے تین اجلاس ہوئے۔ ۹ر فروری کے سابقہ اجلاس میں مقامی احباب کے علاوہ بھیرہ، فروکہ اور شاہ پور صدر کے احباب نے بھی شرکت کی۔ اس موقع پر بزم کے نئے رکن محترم محمد طفیل صاحب نے افطاری کا انتظام کیا۔ جس کے بعد سب احباب نے ریڈیو سے پرویز صاحب کی نشری تقریر کو سنا۔ چودھری نصراللہ خاں صاحب (ترجمان ضلع) نے حسب وعدہ بزم خواتین کے لئے "طاہرہ کے نام خطوط" کے بارہ سیٹ پیش کئے۔ محترم مشتاق علی، صغیر خان، عبدالکریم صاحب، یونس کمال لودھی اور ممتاز صاحب علی الترتیب شاہ پور صدر، جوہر آباد، بھیرہ، میانوالی اور فروکہ میں قرآنی فکر کے نقیب بن کر کام کر رہے ہیں۔ نمائندہ بزم فیاض علی خاں صاحب ۳ر مارچ کو قرآنی مشن پر جوہر آباد گئے اور وہاں محترم شرافت علی صاحب کے دولتکدہ پر مدعو احباب سے خطاب کیا۔ جس سے متاثر ہو کر تین نئے احباب نے بزم ضلع کی رکنیت قبول کی۔

بزم خواتین بھی سرگرم عمل ہے اور اس ماہ اس کے دو اجلاس ہو چکے ہیں۔

جھنگ

ترجمان ضلع شیخ سلطان احمد بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی کی صدارت میں احباب ضلع کا اجتماع ہوا۔ اجلاس میں ایک قرارداد کے ذریعے عائلی زندگی میں قرآنی ضابطوں کے نفاذ پر صدر محمد ایوب کی حکومت کو ہدیۂ تحسین و تبریک پیش کیا گیا۔ قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کے سلسلے میں خواتین کی تنظیم کا مسئلہ آئندہ اجلاس پر ملتوی رکھا گیا۔ سالانہ کنونشن کے لئے موثر نمائندگی، اجلاس ہائے ماہانہ کا باضابطہ انعقاد اور دیگر امور زیر بحث لائے گئے۔

رسول نگر (ضلع گوجرانوالہ)

گذشتہ اجلاس میں طلوع اسلام کے خریدار بڑھانے کی تجاویز زیر غور لائی گئیں۔ محترم قاضی حفیظ الدین صاحب (رئیس اعظم و نمائندہ بزم) نے لغات القرآن کی شائع شدہ تینوں جلدیں بزم کو پیش کیں اور اپنے چار عزیزوں کے نام "طلوع اسلام" جاری کرانے کا اعلان کیا۔ انھوں نے پرویز صاحب کی نشری تقریر سننے کے لئے، احباب کے لئے دفتر بزم میں ریڈیو کا بھی انتظام فرمایا۔

حسین (ضلع جہلم)

۴ر مارچ کو ڈاکٹر ولایت خاں کے ہاں نماز عشا کے بعد بزم کا اجلاس ہوا۔ ترجمان ضلع سید امیر حسین شاہ صاحب نے صدارت کی۔ نمائندہ بزم سید محمد حسین شاہ صاحب نے آئندہ کنونشن کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ مولوی محمد زمان صاحب نے سورۂ والضحیٰ کا مفہوم اور ڈاکٹر محمد اکرم صاحب نے لغات القرآن سے اہم نکات پیش کئے۔ سال آئندہ کے لئے سید امیر حسین شاہ صاحب از سر نو

پھر نمائندہ بزم منتخب ہوگئے۔

لیّہ
(ضلع مظفرگڑھ)

یہ نئی بزم شب و روز ترقی پذیر ہے اور احباب کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ نمائندہ بزم محترم حسن دین خاں صاحب بھکر (ضلع میانوالی) تبدیل ہوگئے ہیں۔ ان کے بعد احباب نے اپنی نمائندگی کا اعزاز کیپٹن غلام حیدر خاں صاحب کے سپرد کیا ہے۔

پنڈدادن خاں
(ضلع جہلم)

بزم کا اجلاس ۳؍مارچ کو نمائندہ بزم خواجہ خدا بخش صاحب کی صدارت میں ہوا، مجلس عاملہ کے سرکلر کی روشنی میں اہل علم اصحاب کی فہرست مرتب کی گئی۔ کنونشن میں شریک ہونے والے نمائندوں سے داخلہ کنونشن کی وصولی اور ترسیل کا کام نمائندہ بزم اور جناب عبدالرحیم خاں کے سپرد کیا گیا۔ محترم حافظ عبدالمجید صاحب نے اپنی خدمات کنونشن کے لئے بطور رضاکار پیش کیں۔ لٹریچر کی تقسیم جاری ہے۔ اور اس کے نتائج بڑے خوشگوار ہیں۔

بورے والا
(ضلع ملتان)

بزم کے ہفتہ وار اجتماعات باقاعدگی سے ہو رہے ہیں۔ طلوع اسلام کے قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کی کوششیں برابر جاری ہیں۔ "طلوع اسلام" اور ادارہ سے شائع شدہ پمفلٹوں کی تقسیم اور پھر اس کے نتائج کا پورا جائزہ پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ عوام کی دلچسپیاں بڑھ رہی ہیں اور طلوع اسلام کے نئے خریدار پیدا کئے جا رہے ہیں۔ نواحی بستیوں میں دوروں کا سلسلہ بھی کامیابی سے قائم ہے۔

عید کی تقریب پر پمفلٹوں اور تعارفی اشتہارات کو وسیع پیمانے پر تقسیم کیا گیا۔

چنیوٹ
(ضلع جھنگ)

۱۵؍مارچ کو بزم کا اجلاس ہوا۔ اس اجلاس میں چک جھمرہ (ضلع لائل پور) میں قائم شدہ نئی بزم کے نمائندہ محترم میر محمد اسلم صاحب نے بھی شرکت کی۔ اس اجلاس نے میر صاحب کی قیام بزم کی کامیاب کوشش پر مبارکباد پیش کی اور مجلس عاملہ اور ادارہ طلوع اسلام کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے چند ضروری تجاویز مرتب کیں۔

چک جھمرہ
(ضلع لائلپور)

محترم میر محمد اسلم صاحب کی کوششوں سے یہاں بزم کا قیام عمل میں آگیا ہے۔ اس سلسلے میں مقامی احباب کا پہلا اجتماع ۱۳؍مارچ کو ہوا۔ سب احباب نے باضابطہ فارم رکنیت پر کئے اور اتفاق رائے سے میر صاحب موصوف کو نمائندہ بزم منتخب کر لیا گیا۔

(ادارہ بزم کے قیام کی منظوری کا اعلان کرتا ہے۔)

برمنگھم میں بزم کا قیام

نہایت مسرت کے ساتھ اطلاع دی جاتی ہے کہ بفضل خدا برمنگھم میں بھی بزم طلوع اسلام قائم ہو چکی ہے۔ برمنگھم لندن سے ۱۲۵ میل دور ہے۔ اور سٹیل انڈسٹری کا ایک بہت بڑا مرکز ہے۔ آبادی کے لحاظ سے بھی لندن سے دوسرے درجہ پر ہے۔ یہاں پاکستانی بھائی کافی تعداد

میں آباد ہیں۔

محترم محمد چغتائی صاحب اور جناب حمید احمد نثار صاحب کی کوششوں سے ابتدائی میٹنگ کے لئے ۲۵ر فروری مقرر ہو چکی تھی۔ چنانچہ چغتائی صاحب اور ان کی بیگم صاحبہ۔ محمد افضل جہانگیر صاحب نمائندہ بزم طلوعِ اسلام لندن اور میاں عبدالخالق صاحب ہفتہ کی دوپہر کو بذریعہ کار برمنگھم پہنچے۔ اسی رات چند دوستوں نے ٹیپ ریکارڈر پر محترم پرویز صاحب کی تقریر "رحمۃ اللعٰلمین" کو نہایت دلچسپی کے ساتھ سنا۔ دوسرے دن بروز اتوار دو بجے دوپہر نثار صاحب کی کوٹھی پر پہلا اجتماع ہوا۔ خواتین سمیت ۲۵ افراد نے شرکت کی۔ سب سے پہلے میاں صاحب نے حاضرین کا خیر مقدم کرنے کے بعد مفکرِ قرآن محترم پرویز صاحب کا تعارف کرایا اور واضح کیا کہ ہمارے دورِ حاضرہ کے اس عظیم مفکر نے اپنی ۴۰ سالہ کوششوں سے پاکستان میں ایسا ذہنی انقلاب پیدا کر دیا ہے کہ جس کے خوشگوار نتائج دن بدن سامنے آ رہے ہیں۔ اسلام کا مقصد ہی یہ ہے کہ انسان قرآن کی عطا فرمودہ قدروں کے تحت اجتماعی زندگی بسر کریں کیونکہ مستقل اقدار کے بغیر انسانی زندگی حیواناتی سطح سے بلند نہیں ہو سکتی۔ جب بھی ان قدروں کو انسانوں نے بنائے اشتراک بنا لیا سارے انسان ایک قوم اور ایک ملت بن جائیں گے اور انسانی معاشرہ خود بخود بدل جائے گا۔ بزم طلوعِ اسلام اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ایک تحریک ہے۔ کسی سیاسی پارٹی یا مذہبی فرقہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ ہمارا فریضہ یہ ہے کہ ہم جہاں بھی ہوں وحی کی تعلیم کو زیادہ سے زیادہ آگے پھیلائیں۔ اس کے بعد ان قرآنی سوالات اور جوابات کا ٹیپ سنایا گیا جو سابقہ کنونشن میں ریکارڈ کیا گیا تھا۔ بعد ازاں محترم پرویز صاحب کا پیغام انگلستان کے بھائیوں کے نام سنایا گیا جس کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ اس کے بعد میاں صاحب کی تجویز پر بزم کی تشکیل ہوئی اور حاضرین نے متفقہ طور پر محترم حمید احمد نثار صاحب کو نمائندہ منتخب کیا۔

قرآنی فکر کی نشر و اشاعت اور طلوعِ اسلام کے لٹریچر کے متعلق احباب میں کافی دیر گفتگو ہوتی رہی۔ کئی تجویزیں زیرِ غور آئیں اور بالآخر یہ طے پایا کہ سب سے زیادہ آسان اور مؤثر طریقہ یہ ہے کہ رسالہ طلوعِ اسلام زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچایا جائے۔ چنانچہ محترم چغتائی صاحب نے پیشکش کی کہ انھیں بے حد ایسے دوستوں کے پتے مہیا کئے جائیں جنھیں طلوعِ اسلام بھیجنا مفید ہو سکتا ہے وہ ان تمام احباب کے نام اپنی طرف سے پرچہ جاری کرا دیں گے۔ چغتائی صاحب کی ایک اور آرزو یہ ہے کہ یورپین قومیں جو ہم سے کہیں زیادہ آگے بڑھ چکی ہیں ان تک خالص قرآن پہنچایا جائے۔ محترم پرویز صاحب کا لکھا ہوا مفہوم القرآن جب طبع ہوگا تو وہ اس کا جرمنی زبان میں ترجمہ کرائیں گے۔

نمائندہ بزم محترم حمید احمد نثار صاحب گریجویٹ ہیں اور لاہور کے رہنے والے ہیں۔ عرصہ چھ سات سال سے برمنگھم میں کاروبار کرتے ہیں۔ کاروباری حلقہ میں انھیں ممتاز حیثیت حاصل ہے آپ برمنگھم کے یورپین طرز کے ہوٹل (ASTORIA) کے مالک بھی ہیں۔ احباب کی اطلاع کے لئے ان کا پتہ درج ذیل کیا جاتا ہے۔ بزم کے دفتر کا ایڈریس بھی یہی ہے۔

MR. H. A. NISAR　54, PORTLAND ROAD

EDGBASTON — BIRMINGHAM. 16.

ENGLAND

طلوع اسلام

برمنگھم کی بزم طلوع اسلام کی منظوری دی جاتی ہے۔ اور ان احباب کی خدمت میں دلی ہدیۂ تشکر پیش کیا جاتا ہے جن کی کوششوں سے اس بزم کا قیام عمل میں آیا۔ اللہ تعالیٰ ان احباب کی ہمت میں برکت عطا فرمائے تاکہ وہ خدا کے پیغام کو اس سرزمین میں، جہاں اس کی واقعی اشد ضرورت ہے، دور دور تک پہنچا سکیں۔

ایک ضروری اعلان

(قارئین توجہ فرمائیں)

ادارہ طلوع اسلام کی مطبوعات کی اشاعت و فروخت کا کام میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ (۲۷-بی شاہ عالم مارکیٹ - لاہور) کے سپرد کر دیا گیا ہے۔ اس لئے حسب ذیل امور کو خاص طور پر پیش نظر رکھا جائے۔

(۱) حسب ضرورت ادارہ کی مطبوعات کے لئے ہمیشہ میزان پبلیکیشنز کی طرف رجوع کیجئے۔ ادارہ طلوع اسلام کا اب ان کی اشاعت و فروخت سے کوئی تعلق نہیں۔

(۲) ماہنامہ "طلوع اسلام" براہ راست ادارہ کی تحویل میں ہے اس لئے یہ ضروری ہے کہ اس سلسلے میں ہر قسم کی خط و کتابت ادارہ طلوع اسلام سے کی جائے۔ میزان پبلیکیشنز والوں سے نہیں۔

(۳) ہمارے خریداران نوٹ فرمالیں کہ ان کے تمام حسابات متعلقہ سے میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ کو منتقل ہو گئے ہیں، اس لئے ہر متعلقہ ضرورت کے لئے انھیں میزان پبلیکیشنز کو لکھنا چاہیئے۔

"ادارہ" اور "میزان" کے حسابات میں کوئی باہمی تعلق نہیں۔

اس لئے انھیں طلوع اسلام کا چندہ براہ راست ادارہ کو بھیجنا ہوگا۔ وہ ان کے میزان کے حساب سے محسوب نہیں ہو سکے گا۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام
۲۵-بی گلبرگ — لاہور

(بقیہ صفحہ سے آگے)

کہ جو چیز قرآن کے خلاف ہو وہ اسلامی شریعت ہو نہیں سکتی۔

بعض حلقوں کی طرف سے یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس ری پریزنٹیشن کی رُو سے بنیادی جمہوریتوں کی یونین کونسل کے صدر کو مجوزہ ثالثی کونسل کے صدر کی حیثیت دی گئی ہے۔ یہ انتظام اطمینان بخش نہیں ہوگا۔ ہمارا بھی یہی خیال ہے کہ اگر یہ معاملہ خاص عدالت کے سپرد کیا جاتا تو زیادہ مناسب تھا۔ بایں ہمہ اس کا تعلق اصل قانون سے نہیں طریقِ کار سے ہے۔ اور طریقِ کار کوئی ایسی ابدی حقیقت نہیں ہوتی جسے کسی صورت میں بدلا ہی نہ جا سکے۔ اگر عملی تجربہ نے بتایا کہ یہ طریقِ کار اطمینان بخش نہیں اور عدالتیں اس سے بہتر ثابت ہو سکتی ہیں تو اس طریق کو بدل دینا کونسا مشکل کام ہوگا۔

بہرحال ہم آخر میں ایک بار پھر حکومتِ پاکستان کو اُس کے اس نہایت مستحسن اقدام پر دلی مبارک سمجھتے ہیں اور اس سے گذارش کرتے ہیں کہ:۔

(۱)۔ وہ اس آرڈیننس کی جزئیات جلد از جلد مرتب کر کے اسے عملاً نافذ کرنے میں تاخیر نہ کرے۔ نیز جزئیات اور طریقِ کار میں بھی اس چیز کو ملحوظ رکھا جائے کہ ان میں کوئی بات قرآنی منشاء کے خلاف نہ ہو۔

(۲)۔ ان قوانین میں قرآنی منشار کی رُو سے جو کمی یا کمزوری رہ گئی ہے اُسے پوری یا رفع کرنے کی کوشش کی جائے۔ نیز ملک کے دیگر قوانین کو قرآن کریم کے مطابق مرتب کرنے کے لئے جلد از جلد مناسب اقدامات کئے جائیں۔ علاوہ بریں ملک میں جہیز یا شادی کے اخراجات کے سلسلہ میں جو نقصان رساں رسومات رائج ہو گئی ہیں اُن کے انسداد کی طرف بھی توجہ دی جائے۔

(۳)۔ مذہب اور سیاست کی جس ثنویت کی رُو سے مملکت اور مذہبی پیشوائیت متوازی حکومتوں کی حیثیت اختیار کر چکی ہیں اسے بہت جلد ختم کیا جائے۔ اس کا عملی طریق اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ ملک میں قرآنی نظام قائم کیا جائے۔ یہی پاکستان کے قیام سے مقصود تھا، اور اسی میں انسانیت کی فلاح و بہبود کا راز مضمر ہے۔

طلوعِ اسلام کا آئندہ پرچہ

یکم جون کو شائع ہوگا

اپریل میں طلوعِ اسلام کنونشن منعقد ہو رہی ہے۔ اس کی روئداد۔ تقاریر اور تصاویر طلوعِ اسلام کے آئندہ پرچہ میں شائع ہوں گی۔ چونکہ اس کے لئے کافی وقت درکار ہوگا، اس لئے آئندہ پرچہ یکم مئی کے بجائے یکم جون کو شائع ہوگا۔ یہ پرچہ مئی اور جون کا مشترکہ نمبر ہوگا اور قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے۔ قارئین اور ایجنٹ حضرات نوٹ فرمالیں۔

(ناظم)